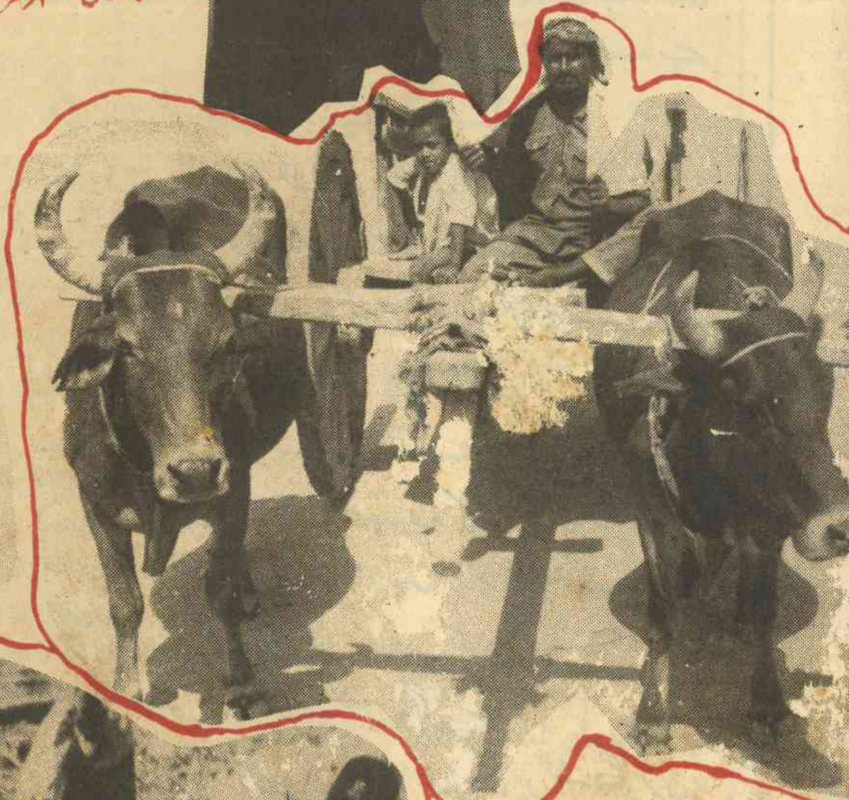
ہفت روزہ
# الفتح
کراچی

۲۸ جنوری - ۴ فروری سنہ ۱۹۷۱ء









## عوام کے لئے
## نظام بدلنا پڑے گا

قیمت: مغربی پاکستان = ۵۰ پیسے
مشرقی پاکستان = ۷۰ پیسے

سیّد محسن نقوی

"ابھی میں
کِس طرح
کہوں کہ
انقلاب
آگیا"

ابھی تو ہر فصیلِ شہر پہ لہُو کا رنگ ہے
ابھی تو دل میں تاج و تخت کی حسیں اُمنگ ہے

ابھی تو دُھوپ چھاؤں سے اُلجھ رہی ہے زِندگی
ابھی تو اہلِ زر کے ساتھ اہلِ دِل کی جنگ ہے

ابھی مکانِ محتسب میں اُڑ رہے ہیں قہقہے
ابھی دُکانِ شیشہ گر میں قحطِ خشت وسنگ ہے

ابھی دُھواں دُھواں فضا پہ وحشیوں کا راج ہے
ابھی تو زندگی ہوا میں ڈولتی پتنگ ہے

ابھی فشارِ جنگ میں سمٹ رہی ہیں وُسعتیں!
ابھی نگارِ عافیت کا پیرہن بھی تنگ ہے

ابھی کہاں صلیب دار کی حسین رفعتیں:
ابھی تو ہم مسافروں کو فکرِ نام و ننگ ہے

ابھی کہاں یہ ہوش ہے کہ خُوں بہا طلب کریں
ابھی تو مُنصِفوں کے فیصلے پہ عقل دنگ ہے

ابھی یہ سوچنا ہے، کس زباں میں گفتگو کریں؟
ابھی تو "لہو ترنگ" کا خطاب "جلترنگ" ہے

ابھی مَیں کیوں کہوں کہ زیست پر شباب آگیا
ابھی مَیں کس طرح کہوں کہ "انقلاب" آگیا

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ

# الفتح

کراچی

جلد:- ۱ شمارہ:- ۳۷

۲۸ جنوری - ۴ فروری ۱۹۷۱ء

نگرانِ اعلیٰ

شوکت صدیقی

*

مدیر

ارشاد راؤ

*

معاونین خصوصی

صفدر میر ــــ منہاج برنا

*

مجلسِ ادارت

محمود شام - اشرف شاد - وہاب صدیقی




اداریہ

## امریکہ کے خلاف کیوں نہیں؟

برادر ملک ترکی کے وزیراعظم جناب سلیمان ڈیمرل نے بالآخر میثاقِ استنبول کی سازش کا راز فاش کر ہی دیا۔ ہمارے نزدیک یہ تجویز نئی نہیں کہ پاکستان، ایران اور ترکی میں کمیونزم کی روک تھام اور چین اور روس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لئے ایک مشترکہ محاذ قائم کیا جائے۔ اس کا دوسرا مطلب صاف ہے کہ تینوں ممالک کے عوام کو امریکی سامراج کی گود میں ڈال دیا جائے تاکہ سامراج اس مرکز سے دُنیا بھر کے حریت پسندوں، مظلوم عوام اور امریکی سامراج کے دُشمنوں اور عوام دوست طاقتوں کے خلاف اپنے ناپاک اور گھناؤنے عزائم پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔

جناب ڈیمرل یہ بھول گئے ہیں کہ تینوں ممالک کے عوام نے یک زبان ہو کر امریکی سامراج کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ وہ یہ تہیہ کر چکے ہیں کہ امریکی سامراج کا قبرستان ترکی، ایران اور پاکستان ہوں گے۔ حکمران ٹولے نے عوامی خواہشات کے خلاف ہر دَور میں اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے سامراجیوں کی دلالی کی ہے۔ ان دلالوں نے وطن تک بیچ دیئے ہیں۔ قوموں کی عزت و ناموس کو امریکی درندوں کے ہاتھوں لٹا دیا ہے اور یہ لٹیرے بربریت کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔


بدلِ اشتراک

| | فی پرچہ | سالانہ | ششماہی |
|---|---|---|---|
| مغربی پاکستان | ۵۰ پیسے | ۲۵ روپے | ۱۳ روپے |
| مشرقی پاکستان | ۶۰ پیسے | ۳۰ روپے | ۱۶ روپے |

خط و کتابت کے لئے

دفتر ہفت روزہ "الفتح"، ۸۰ ڈی۔ نرسری کمرشل ایریا۔ پی، ای، سی، ایچ، ایس۔ کراچی ۲۹

ایڈیٹر پبلشر ارشاد راؤ۔ مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد کراچی

مقام اشاعت: ۸۰ ڈی نرسری کمرشل ایریا، پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی ۲۹

اس کے جواب میں زندہ قوموں نے جہاں اِن دلالوں کی کھالیں کھینچ کر بھُس بھرا ہے وہاں امریکی سامراج کو وہ عبرت ناک شکست دی ہے کہ واشنگٹن کے در و دیوار ہل گئے۔

جناب ڈیمرل کو حال ہی میں کمبوڈیا میں امریکی جارحیت اور امریکی دلالوں کے حشر کا پتہ چل گیا ہوگا۔ کمبوڈیا کے حریت پسند اور قوم پرست سروں پر کفن باندھے ہوئے شیروں کی طرح مقابلہ کر رہے ہیں، فتح و نصرت اُن کے قدم چوم رہی ہے اور پوری دنیا حیران ہے کہ یہ کیا ہوگیا۔ ویت نام کی زندہ و جاوید جدوجہد کو دہرانے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ فلسطین کی صورت حال بھی اب واضح ہوگئی ہے اور سامراجی دلالوں کے چہرے بھی روشن ہوگئے ہیں۔

جناب ڈیمرل! ترکی میں کیا ہورہا ہے؟ کہیں آپ کا یہ بیان اسی بوکھلاہٹ کا نتیجہ تو نہیں۔ نوجوان امریکی سامراج کے خلاف سینہ سپر ہیں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کو اُن کے ساتھ مل جانا چاہیئے ہمارا یہ مشورہ خلوص اور دیانت پر مبنی ہے۔ ہمارے نزدیک ترکی، ایران اور پاکستان کے تعلقات بہت عزیز ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ یہ تعلقات خراب ہوں بلکہ انہیں مزید مضبوط بنانے کے لئے یہ عرض کر رہے ہیں کہ ترکی کے عوام کا صحیح ترجمان وہی ہوگا جو امریکی سامراج کا دشمن ہوگا۔ ترکی کے عوام سامراجی دلالوں کو ہرگز پسند نہیں کریں گے۔

آپ نے پاکستان کے عوام کا فیصلہ ملاحظہ کرلیا ہے۔ مبصرین نے آپ کے بیان کے ساتھ اس فیصلے کو شائع کرتے ہُوئے لکھا ہے کہ آپ کے بیان کے پس منظر میں پاکستان میں بائیں بازو کی جیت کا صدمہ بھی کار فرما ہے۔ یہ درست ہے کہ پاکستان کے عوام ترک عوام کو بھائی کہہ کر پکارتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی قومی جنگ میں ترکی کی امداد پر بھی ترک بھائیوں کے ممنونِ احسان ہیں لیکن ایک غیور قوم کی حیثیت سے ہم اس بات کی اجازت کسی قریب ترین دوست کو بھی نہیں دیں گے کہ وہ ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے۔ یہ فیصلہ پاکستانی عوام کا ہے اس کے خلاف کسی سامراجی سازش کو برداشت نہیں کیا جائے گا چاہے اس کے لئے ہمیں کتنی بڑی قربانی کیوں نہ دینا پڑے۔ ہمارے عوام اچھی طرح جانتے ہیں کہ دشمن اور دوست کون ہے۔ وہ امریکہ کو دشمن اور چین کو اپنا عظیم دوست جانتے ہیں۔ وہ پاک چین دوستی کے راستے میں رکاوٹیں برداشت نہیں کریں گے بلکہ اُسے مضبوط بنانے کے لئے پیش قدمی کرتے رہیں گے۔

جناب ڈیمرل یہ جان کر "خوش" ہوں گے کہ پاکستان، ایران اور ترکی کے عوام کی یہ دیرینہ خواہش ہے کہ وہ امریکی سامراج کے خلاف ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ پاکستان کے عوام نے اپنے حکمران طبقے کو اس کا احساس دلا دیا ہے۔ کیا ڈیمرل صاحب اپنے عوام کی جانب سے ایران کے اعلیٰحضرت شہنشاہ رضا شاہ پہلوی اور پاکستان کے صدر یحییٰ سے رجوع کریں گے کہ وہ آر۔سی۔ڈی کو عوام دشمنی کی بجائے عوام دوستی کا مظہر بنائیں اور آر سی ڈی امریکی مفادات کی نگرانی کی بجائے امریکی سامراج کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دے۔ ایسا نہ ہوا تو آر۔سی۔ڈی کو ختم ہونا پڑے گا۔ کوئی امریکی اڈہ برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان کے عوام ایران اور ترکی میں سامراجیوں اور ان کے دلالوں کو ملیامیٹ کرنے کے لئے ایران اور ترکی کے عوام کے شانہ بشانہ لڑیں گے۔ ایک مخلص بھائی اپنے دوسرے بھائی کے لئے لازماً یہی کرے گا۔

## دُنیا بھر کے عوام کی لڑائی امریکی سامراج کے خلاف ہے

پیپلز پارٹی کے مرکزی اجلاس میں

# انتخابی نتائج کا پوسٹ مارٹم

## صحافیوں کو بحال نہ کرنے والوں کا محاسبہ ہوگا

محمود شام

پیپلز پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے اپنے دوروزہ اجلاس میں نہایت اہم عوامی فیصلے کئے۔

ہم نے انہی کالموں میں ملکی سیاسی صورتِ حال کے پیشِ نظر درخواست کی تھی کہ مختلف مسائل کے سلسلے میں ماہرین اور پیپلز پارٹی کے نمائندوں پر مشتمل نگراں کمیٹیاں بنائی جائیں۔ جو موجود مسائل کا جائزہ لے کر ان کی رپورٹیں تیار کریں، فوری نوعیت کے مسائل کے حل کے لئے حکومتوں سے رابطہ قائم کریں اور فوری حل پر زور دیں۔ اقتدار کی منتقلی تک بیوروکریسی اور سرمایہ داروں کو سازشوں کے ذریعے عوام کو مشکلات میں مبتلا ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔

مرکزی کمیٹی نے جمہوری انداز میں تمام مسائل کا جائزہ لیا۔ سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد کے تمام نمائندوں نے کھل کر اپنا مؤقف بیان کیا۔ انتخابی نتائج کا "پوسٹ مارٹم" کرتے ہوئے ان تمام عوامل کا ذکر آیا، جو جیتنے یا ہارنے کا محرک بنے۔ پارٹی کے خلاف جو پراپیگنڈہ کیا گیا، اس کی ماہیت اور حقیقت بھی زیرِ بحث آئی۔ سب سے اہم یہ کہ پارٹی کے اندر جو عناصر پارٹی کے اصولوں کو توڑ کر پارٹی کے امیدواروں کی درپردہ مخالفت کرتے رہے، ان پر گرما گرم بحث ہوئی اور ہر علاقے کی کالی بھیڑوں کا کچا چٹھہ کھولا گیا۔ پارٹی کے ترجمان اخبارات کی پالیسیوں پر کمیٹی کے ارکان نے کھل کر بات چیت کی۔ بعض خامیوں پر نکتہ چینی کے بعد آئندہ کے لئے پالیسی متعین کی گئی۔ اس بات کا خاص طور پر نوٹس لیا گیا کہ پارٹی کے ارکان پارٹی ڈسپلن کی پرواہ کئے بغیر انفرادی طور پر قدم اٹھاتے ہیں۔ جس سے عوام میں غلط فہمیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس لئے آئندہ پارٹی کا کوئی رکن یا لیڈر متعلقہ کمیٹی سے مشورہ کئے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔

مرکزی کمیٹی نے تنظیمی ڈھانچوں کے سلسلے میں مرکز، صوبوں، ضلعوں اور شہروں میں تنظیم نو کے لئے جو نئے اعلانات کئے ہیں، ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اب چیئرمین کا عہدہ صرف مرکز میں ہوگا۔ صوبوں، ضلعوں اور شہروں کے سربراہ۔ پریذیڈنٹ کہلوائیں گے۔ فی الحال بلدیاتی اداروں کے انتخابات تک ان تمام عہدوں پر نامزدگیاں کی جائیں گی۔ بلدیاتی اداروں کے انتخابات کے بعد نئی رکنیت سازی ہوگی اور اس کے مطابق پارٹی کے انتخابات منعقد ہوں گے۔ ایک برس تک نامزدگیاں جاری رہیں گی۔

مرکزی کمیٹی نے ایک بات کی وضاحت نہیں کی ہے۔ کہ پارٹی کے عہدے اور سرکاری عہدے الگ الگ رکھے جائیں گے یا بعض لوگوں کے پاس دونوں عہدے بھی رہ سکیں گے۔ اس سے پہلے بھٹو صاحب اپنے کئی بیانات میں یہ کہہ چکے ہیں کہ پارٹی کے اور سرکاری عہدے الگ الگ رکھے جائیں گے۔

مرکزی کمیٹی نے جو اہم کمیٹیاں قائم کی ہیں وہ یہ ہیں، (۱) اقتصادی کمیٹی۔ ۲۔ انتظامی اصلاحات کمیٹی۔ ۳۔ کمیٹی برائے آزادیٔ کشمیر۔ ۴، امور خارجہ کمیٹی، ۵۔ یوتھ ایجوکیشن کلچرل کمیٹی، ۶، لیبر کمیٹی، ۷، زرعی اصلاحات کمیٹی — ان کمیٹیوں کے ڈھانچوں اور کمیٹیوں کے ممبران کے ناموں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ آئینی کمیٹی کے ناموں کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ اس میں زیادہ تر قانونی ماہرین یعنی وکلاء کو شامل کیا گیا ہے، اور ہر صوبے کو متناسب نمائندگی دی گئی ہے۔

صنعتی اداروں سے مزدوروں کی برطرفیاں اور زمینوں سے کسانوں کی بے دخلیاں بھی زیرِ غور آئیں۔ اس سلسلے میں پیپلز پارٹی کے تمام وعدوں کے مطابق مرکزی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ لیبر اور لینڈ ریفارم کمیٹی ایسی رپورٹیں مرتب کرے جن میں تمام اداروں سے برطرف ہونے والے مزدوروں کی تعداد اور مدت ضبطِ تحریر میں آجائے۔ ان صنعتی اور تجارتی اداروں میں اخباری اداروں کا بھی بالخصوص ذکر آیا۔ تمام اخبارات سے نکالے جانے والے صحافیوں اور دوسرے اخباری کارکنوں کی برطرفیوں پر بھی اس ضمن میں غور کیا گیا۔ متعلقہ کمیٹیاں اپنی رپورٹیں بھی تیار کریں گی اور دریں اثنا، متعلقہ اداروں پر بھی زور دیں گی کہ وہ عوامی حکومتوں کے قیام سے پہلے ہی

---

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

### کی طرف سے

مجیب بھٹو مذاکرات کی تفصیلات سے قارئین کو آگاہ کرنے کے لئے "الفتح" کی طرف سے خصوصی وقائع نویس محمود شام ڈھاکہ جارہے ہیں۔ آئندہ اشاعت میں اس ملاقات کے بارے میں "الفتح" کی خصوصی رپورٹ ملاحظہ کیجئے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کی بعداز انتخابات سیاسی صورتِ حال پر بھی وہ ایک سلسلۂ مضامین لکھیں گے

اپنے تمام برطرف شدہ کارکنوں کو ان کی سابقہ ملازمتوں پر عہدے اور تنخواہ کے اعتبار سے بحال کرے۔ بھٹو صاحب نے اخباری نمائندوں کے سامنے اس بات پر خاص طور پر زور دیا اور کہا کہ ان ملازموں کی بحالی۔ مکمل معاوضے کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ اور جب میں معاوضے کا لفظ استعمال کرتا ہوں، تو یہ اپنے بھرپور معانی اور مفہوم کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تنخواہ، دوسرے لوازمات، عہدہ اور برطرفی کے دنوں کا معاوضہ بھی۔ مرکزی کمیٹی کے ارکان نے اس بات کو پارٹی کی انتہائی نازک اور اہم ذمہ داری قرار دیا کہ ایسے ادارے اگر مزدور دشمنی سے باز نہیں آئیں گے اور برطرف ہونے والے کارکنوں کو مکمل معاوضے کے ساتھ واپس نہیں لیں گے تو عوامی حکومت اپنے قیام کے فوراً بعد سب سے پہلے انہی اداروں کا انتہائی سخت محاسبہ کرے گی۔ اس کے ساتھ ان زمینداروں کو بھی متنبہ کیا گیا جو مختلف قسم کی کارروائیوں کے ذریعے زرعی اصلاحات کے پروگرام کو سبوتاژ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

قیمتوں میں اضافے کے سلسلے میں عوام سے امید ظاہر کی گئی ہے کہ وہ سرمایہ داروں اور بیوروکریسی کی اس سازش کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ جو انتقالِ اقتدار میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے کی گئی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ بھٹو صاحب نے پاکستان کے سیکرٹری وزارتِ خارجہ کے سنگاپور میں دیئے گئے اس بیان پر سخت تنقید کی جس میں انہوں نے کہا ہے کہ "پاکستان بائیں بازو کی طرف نہیں جھک رہا ہے۔" بھٹو صاحب نے کہا کہ یہ سیکرٹری وزارتِ خارجہ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کو تسلی دیتے پھریں کہ پاکستان بائیں بازو کی طرف نہیں جا رہا ہے۔ یہ ہمارا داخلی مسئلہ ہے، دوسرے ملکوں کے سامنے اسے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ سیکرٹری وزارتِ خارجہ کے اختیارات میں شامل ہے۔

بھٹو صاحب یہ بروقت تنقید نہایت مناسب ہے کیونکہ سیکرٹری وزارتِ خارجہ کو اس قسم کے بیانات دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور نہ وہ اس سے دوسرے ملکوں کو تسلی دے سکتے ہیں، کیونکہ دنیا جانتی ہے پاکستان کے عوام نے کس نظریئے کو ووٹ دیا ہے۔ دونوں اکثریتی جماعتوں کے لیڈر بار بار اقرار کر رہے ہیں کہ ہم سوشلسٹ معاشی نظام رائج کریں گے۔ پھر "بایاں بازو" اور کسے کہتے ہیں۔ یا پھر خارجہ سیکرٹری صاحب کے ذہن میں کوئی ایسی بات ہے کہ وہ ان پارٹیوں کو سوشلسٹ نظام رائج نہیں کرنے دیں گے؟ سیکرٹری صاحب کا یہ بیان انتہائی گمراہ کن اور قابلِ مذمت ہے۔

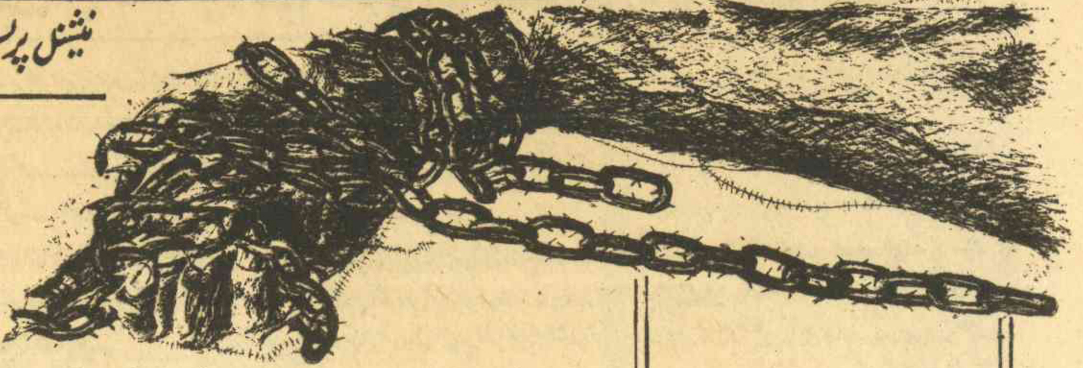
## مسٹر بھٹو کا پندرہ رکنی وفد

(۱) مسٹر بھٹو (چیئرمین) - (۲) جے اے رحیم (سیکرٹری جنرل)، (۳) میر رسول بخش تالپور، (پریذیڈنٹ سندھ)، (۴) شیخ رشید (پریذیڈنٹ، پنجاب) (۵) حیات محمد شیرپاؤ (پریذیڈنٹ سرحد) (۶) طاہر محمد خان (بلوچستان) (۷)، ڈاکٹر مبشر حسن (سیکرٹری مال) (۸) مولانا کوثر نیازی (سیکرٹری اطلاعات) (۹)، سابق میجر جنرل اکبر خان (سیکرٹری پیپلز گارڈ) (۱۰) حنیف رامے (۱۱) معراج محمد خان (۱۲) عبدالحفیظ پیرزادہ (۱۳) میاں محمود علی قصوری (۱۴) مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ (۱۵) غلام مصطفیٰ کھر

### پارٹی کے ارکان جو بھٹو کی دعوت پر جا رہے ہیں

(۱) کمال اظفر: بارایٹ لا (۲) قاسم حاجی عباس پٹیل (رکن سندھ اسمبلی) (۳) طارق عزیز (۴) رؤف طاہر۔

نیشنل پریس ٹرسٹ (۱)



# قومی صحافت کے خلاف ایک سازش

## چند حقائق، چند انکشافات

شوکت صدیقی

نیشنل پریس ٹرسٹ کے بارے میں حکومت کے مؤقف کا اظہار کرتے ہوئے صدر یحییٰ نے کہا ہے کہ "قانون کے تحت نیشنل پریس ٹرسٹ ایک فلاحی ادارہ کی حیثیت سے قائم کیا گیا تھا اور اسے توڑا نہیں جا سکتا۔" اس اظہارِ خیال پر چند بنیادی سوالات پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

۱۔ نیشنل پریس ٹرسٹ کیوں اور کیسے قائم کیا گیا؟

۲۔ کیا واقعی ٹرسٹ فلاحی ادارہ ہے اور اگر فلاحی ادارہ ہے تو اس نے قومی صحافت اور عوام کی کیا خدمات انجام دی ہیں؟

۳۔ موجودہ حیثیت میں اس کے برقرار رکھنے کا کیا قانونی جواز ہے؟

۴۔ اگر ون یونٹ توڑا جا سکتا ہے تو ٹرسٹ کیوں نہیں ٹوٹ سکتا؟

سچ پوچھئے تو ٹرسٹ کے بارے میں شروع ہی سے راز داری سے کام لیا گیا۔ حقائق کو کبھی عوام پر آشکارہ نہیں کیا گیا۔ انہیں کبھی اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بارے میں پہلے ہی دن سے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے جو بڑی حد تک درست بھی ہیں۔ درحقیقت نیشنل پریس ٹرسٹ ایوب خاں کی ہدایت پر قائم کیا گیا تھا اور ان کی آمریت کے تحفظ کے لئے طبقاتی معاشرے میں حکومت بنیادی طور پر طبقاتی آمریت ہوتی ہے لیکن جب طبقاتی آمریت شخصی آمریت کے مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو ڈکٹیٹر جنم لیتا ہے۔ وہ اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھتا۔ خود کو عقلِ کل سمجھتا ہے۔ اختلافِ رائے اس کے لئے وقار کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اور تنقید برچھی کی انی معلوم ہوتی ہے۔ خود پسندی اور انانیت مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

غرضکہ جب ایوب خاں کو اس مرضِ انا کا عارضہ ہوا تو اخبارات کی ہر خلافِ مرضی بات ان کی طبعِ نازک پر گراں گزرتی۔ چنانچہ تاریخِ پاکستان میں پہلی مرتبہ اخبارات براہِ راست استحصال کا شکار ہوئے۔ آغاز اس کا پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے اخبارات پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار سے ہوا۔ مارشل لاء کے ایک قانون کے تحت انہیں حکومت کی تحویل میں لے لیا گیا۔ یہ دن قومی زندگی کا سیاہ ترین دن تھا۔ اظہار و ابلاغ کے جمہوری ذرائع پر یہ اوّلین شب خون تھا۔ اس میں ذاتی اغراض سے زیادہ امریکی دباؤ کو دخل تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایوب خاں کو "شمال" سے خطرہ نظر آتا تھا اور وہ اسکندر مرزا کی طرح بھارت کے ساتھ مشترکہ فوجی کمان کے حامی تھے۔

لیکن ۱۹۶۲ء میں جب عوامی جمہوریۂ چین سے ہزیمت اٹھانے کے بعد بھارت کا جھکاؤ امریکہ کی جانب ہوا اور دونوں کے تعلقات تیزی سے بڑھے تو امریکہ نے پاکستان کی جانب سے نگاہیں پھیر لیں۔ اس تضاد سے خارجہ پالیسی میں نیا موڑ آیا اور داخلہ پالیسی بھی متاثر ہوئی۔ حالات کی اس تبدیلی کے ساتھ اور بھی کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان دنوں ایوب خاں خصوصیت کے ساتھ دو اخبارات سے بہت خفار ہتے تھے اور یہ تھے روزنامہ "نوائے وقت" لاہور اور روزنامہ "اتفاق" ڈھاکہ۔

# ایوب خاں تمام اخبارات کو قومی ملکیت میں لینا چاہتے تھے

یہ دونوں امریکہ کی شہ پر اکثر ایوب خاں کی ٹانگ کھینچتے رہتے تھے۔ چنانچہ دونوں اخبارات کے لئے سرکاری اشتہارات بند کر دیئے گئے۔ وہ پھر بھی باز نہ آئے لیکن سخت ناراضگی کے باوجود وہ ان اخبارات کے خلاف سخت قدم اٹھانے سے کتراتے تھے۔ اس میں امریکہ کو ناراض کرنے کا ڈر تھا اور امریکہ کو اس قدر ناخوش کرنے کی ان میں جرأت نہ تھی۔

پھر کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے ایوب خاں کو اخبارات سے اور بدظن کر دیا۔ اسی دوران گندھارا انڈسٹریز قائم ہوئی۔ جنرل موٹرز، ہارون خاندان سے نکل کر ایوب خاندان میں آگئی۔ اخبارات میں اس کا چرچا ہوا۔ ایوب خاں اور ان کے بیٹوں کا ذکر آیا۔ پھر کرسٹین کیلر اسکینڈل چلا۔ اس میں بھی ایوب خاں کا نام آیا۔ یہ اخبارات سے ایوب خاں کی انتہائی ناراضگی کا دور تھا۔ ان دنوں قدرت اللہ شہاب وزارت اطلاعات کے سیکرٹری تھے اور ایوب خاں سے بہت قریب تھے۔

ایوب خاں اخبارات سے اس قدر خفا تھے کہ تمام اخبارات کو قومی ملکیت میں لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ سنا ہے جب شہاب سے ایوب خاں نے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ شہاب کی رائے یہ تھی کہ اس کا ردِ عمل عوام میں بہت شدید ہوگا اور اگر اخبارات کو قومی ملکیت قرار دینا ایسا ہی ضروری ہے تو اس کے ساتھ بعض بنیادی صنعتوں کو بھی قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔ لیکن ایوب خاں دوسری صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے کے حق میں نہ تھے۔ اس طرح یہ منصوبہ ملتوی ہوگیا۔

لیکن اخبارات کے خلاف ایوب خاں کے دل سے کانٹا نہ نکلا۔ ان کی کدورت برقرار رہی — وہ اخبارات پر کسی نہ کسی طرح پابندیاں عائد کرنا چاہتے تھے اس طرح پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی ننس کی تجویز سامنے آئی۔ پھر اس تجویز نے منصوبے کی شکل اختیار کی۔ اس وقت شیخ خورشید احمد مرحوم، مرکزی وزیرِ قانون تھے۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی۔ انہوں نے آرڈی ننس کا مسودہ تیار کیا پھر اس کی بنیاد پر اخبارات کے مالکان اور

صحافیوں سے مذاکرات ہوئے۔ ان مذاکرات میں آرڈیننس کی بعض دفعات سے صحافیوں نے شدید اختلاف کیا۔ آخر وزیرِ قانون نے ان میں سے بعض دفعات کو خارج کرنے کی ضمانت دی۔

پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس کے بارے میں مرکزی کابینہ میں فیصلہ ہوا مگر اس کو مرکز کی جانب سے نافذ نہ کیا گیا۔ اس کا نفاذ صوبائی سطح پر ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو ہوا۔ قدرت اللہ شہاب نے مرکزی وزیرِ اطلاعات ہونے کے باوجود اس تمام کارروائی میں کوئی کردار ادا نہ کیا۔ وہ اس کے خلاف تھے۔ ان کے خلاف ایوب خاں کو جہاں اور شکایات پیدا ہوئیں وہاں ایک شکایت یہ بھی تھی۔ شہاب کا ستارہ زوال میں آچکا تھا۔ ان کے خلاف امریکہ کا دباؤ شدید سے شدید تر ہوتا جارہا تھا۔ پھر امریکہ سے جارج بال آئے۔ شہاب کے ساتھ وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری دہلوی بھی زیرِ عتاب آئے۔ اگست ۱۹۶۳ء میں شہاب کے تبادلے کا فیصلہ ہوا۔ اکتوبر کے آخری ہفتے میں وہ ہالینڈ کے سفیر بنا کر جلاوطن کر دیئے گئے۔ الطاف گوہر نے نئے سیکرٹری کی حیثیت سے ان سے وزارتِ اطلاعات کا چارج لیا۔ اسی دوران کابینہ میں بھی تبدیلیاں ہوئیں۔ کچھ عرصے کے لئے فضل القادر چودھری مرکزی وزیرِ اطلاعات رہے۔

پی۔ پی۔ ایل کو
حکومت کی تحویل
میں لے لیا گیا۔ اس
میں ذاتی اغراض
سے زیادہ امریکی
دباؤ کو دخل تھا

ان کے بعد عبدالوحید خاں اس وزارت کے وزیر مقرر ہوئے۔

پریس آرڈی ننس نافذ ہوا تو مالکانِ اخبارات خاموش رہے لیکن اکتوبر ۱۹۶۳ء کے دوسرے ہفتے میں عامل صحافیوں نے پی۔ ایف۔ یو۔ جے کے پرچم تلے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ ہڑتال کی۔ یہ ہڑتال ملک گیر سطح پر اتنی کامیاب رہی اور احتجاج اس قدر شدید ہوا کہ حکومت بوکھلا گئی۔ ایوب خاں کو جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ محض قانون بنانے سے اخبارات پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ چنانچہ یہ سوچا گیا کہ کنونشن مسلم لیگ کے لئے ہر بڑے شہر سے اخبارات نکالے جائیں۔ سنا ہے یہ تجویز عبدالوحید خاں نے پیش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب غلام فاروق، ایوب خاں کے بہت قریب آچکے تھے۔ ایوب خاں ان کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ غلام فاروق کی مخالفت کے باعث یہ منصوبہ بھی رد کر دیا گیا۔

ٹرسٹ کا منصوبہ دراصل خود ایوب خاں کے ذہن کی پیداوار تھا جسے الطاف گوہر نے تیار کیا تھا انہوں نے سرکاری سطح پر اخبارات کا ایک ادارہ قائم کرنے کی ایسی سکیم پیش کی جو حکومت کی حمایت میں کام کرے۔ اس وقت تک الطاف گوہر نیشنل بیورو آف ریسرچ اور پاکستان کونسل ایسے سرکاری اداروں کے قیام کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ جب یہ تجویز غلام فاروق کے سامنے آئی تو انہوں نے اس سے اتفاقِ رائے کیا لیکن ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ حکومت اپنے فنڈ سے اخبارات نکالنے کی بجائے صنعت کاروں اور بنکاروں سے سرمایہ حاصل کرے۔ کچھ نئے اخبارات کا اجرا کرے اور کچھ پرانے اخبارات خرید لے۔ ان دنوں وہ آدم جی انڈسٹریز سے وابستہ تھے۔ چنانچہ یہ ذمہ داری بھی ان کے سپرد کی گئی کہ وہ اس سلسلے میں صنعت کاروں سے بات چیت کریں۔

جب غلام فاروق نے فضا ہموار کر لی تو اپریل ۱۹۶۴ء کی ایک خوشگوار صبح اس وقت کے مرکزی وزیرِ ...انہ محمد شعیب راولپنڈی سے کراچی پہنچے۔ شام کو انہوں

نے اپنی سرکاری قیام گاہ قصرِ ناز میں بڑے صنعت کاروں اور تاجروں کو چائے پر بلایا۔ اس میں سرمایہ داروں کے ۱۳۱ نمائندوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر انہوں نے ٹرسٹ کے قیام کی تجویز سب کے سامنے پیش کی اور ایوب خاں کا یہ پیغام سنایا کہ وہ اس کے لئے سرمایہ فراہم کریں۔ چنانچہ ایک لاکھ سے پانچ لاکھ تک فی کس کے حساب سے صنعتی اور بنکار اداروں کی جانب سے ٹرسٹ کے لئے سرمایہ فراہم کیا گیا جس کی مجموعی رقم ۱۵ لاکھ ہوئی۔

حکومت کی خوشنودی کے لئے یہ رقم اسی طرح دی گئی جس طرح خیراتی کاموں کے لئے فلاحی اداروں کو سرکاری افسروں اور حکام کی اپیل پر چندے کی صورت میں عام طور پر دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن صنعتکاروں نے یہ رقم فراہم کی وہ ٹرسٹ کے شیئر ہولڈرز نہ کہلائے بلکہ سٹلرز قرار دیئے گئے۔ کسی نے بھی پریس ٹرسٹ کا کوئی حصہ نہیں خریدا اور نہ اس کے حصے فروخت کے لئے جاری کئے گئے۔ جنہوں نے یہ چندہ دیا انہوں نے انکم ٹیکس معاف کرانے کے علاوہ نہ صرف امپورٹ لائسنس اور پرمٹس حاصل کئے بلکہ اس کے عوض اور دوسری طرح کے مالی اور کاروباری فائدے اور مراعات حاصل کیں۔ اس طرح یہ رقم سٹلرز کی نہ رہی۔ اس پر اگر کسی کا حق ہو سکتا ہے تو وہ انکم ٹیکس کا محکمہ ہے۔ یا بحیثیتِ مجموعی حکومتِ پاکستان کا۔

غرضکہ ۱۵ لاکھ کی اس رقم سے اپریل ۱۹۶۴ء کے آخری ہفتے میں نیشنل پریس ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا۔ جناب اختر حسین اس کے پہلے چیئرمین مقرر کئے گئے۔ اس کے بعد ٹرسٹ کا ایک چارٹر تیار کیا گیا۔ جسے کمپنیز ایکٹ کے تحت رجسٹر کرایا گیا۔ ٹرسٹ کی اگر کوئی قانونی حیثیت ہے تو صرف اس حد تک ہے۔ سرمایہ اس کا صنعت کاروں کے چندے سے فراہم کیا گیا جس نے جتنی رقم دی اسی حساب سے معاوضے میں مراعات بھی حاصل کیں اور وزیرِ خزانہ اور حکومت کی خوشنودی بھی ملی۔

اب اس ٹرسٹ کے فلاحی ادارہ ہونے کا احوال سنیئے۔ رجسٹرڈ چارٹر میں اس کے جو اغراض و مقاصد بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ اس ادارے کے ذریعے ملک میں خالص قومی نقطۂ نظر سے صحتمند اور مستحکم بنیادوں پر

سید عبدالحمید عدم

## قابلِ درگزر

شیر علی خاں کا —— کیوں جلے پتّا ؟

گر صحافی —— کباب ہوتے ہیں

آپ اُٹھیں —— آدمی سمجھتے ہیں

وہ بچارے —— نواب ہوتے ہیں

ملکی صحافت کی نشوونما کی جائے گی۔ اسے علاقائی عصبیت فرقہ واریت اور ایسی ہی دوسری سماجی اور سیاسی برائیوں سے پاک صاف کیا جائے گا تاکہ صحافت کو ملک اور قوم کی خوشحالی، سلامتی اور استحکام کے لئے پوری طرح بروئے کار لایا جائے۔ لیکن کیا ان بلند مقاصد پر عمل ہوا؟ اس نصب العین کو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی؟

## پی ایف یو جے کی قیادت میں صحافیوں نے ہڑتال کی، اور یہ اتنی کامیاب رہی کہ حکومت بوکھلا اُٹھی

قومی صحافت کی صحتمند نشوونما ہوئی؟ ہرگز نہیں! نیشنل پریس ٹرسٹ ایوب خاں اور ان کی حکومت کی پروپیگنڈا مشینری کا ایک حصہ بن گیا جس کے ذریعے ہر وہ بات درست ثابت کی گئی جسے ایوب خاں نے درست کہا اور ہر وہ بات غلط بتائی گئی جسے ایوب خاں نے غلط کہا۔ اس چارٹر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ٹرسٹ کا ایک نو رکنی بورڈ آف ٹرسٹیز ہوگا جس کے مستقل ارکان مندرجہ ذیل ہوں گے:-

(۱) ڈپٹی چیئرمین، پلاننگ کمیشن (۲) ڈائرکٹر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (۳) منیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بنک آف پاکستان (۴) صدر انجمن ترقی اردو، کراچی (۵) وائس چانسلر، پشاور یونیورسٹی (۶) وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی (۷) وائس چانسلر راجشاہی یونیورسٹی۔

چارٹر کے قواعد کے مطابق ان سات قومی اداروں کی لازمی رکنیت اس لئے قرار دی گئی تاکہ ٹرسٹ کو قومی اور عوامی کردار دیا جائے اور کسی خاص طبقے، خصوصیت کے ساتھ سرمایہ داروں کی اجارہ داری سے اسے محفوظ رکھا جائے۔ یہی سبب ہے کہ سٹلرز یعنی چندہ دینے والے صنعتکاروں کے صرف دو نمائندے بورڈ میں بحیثیت ٹرسٹی شامل کئے گئے اور یہ دونوں غلام فاروق اور رنگون والا تھے۔

ٹرسٹ کے قیام کے تقریباً تین ماہ بعد —— جمیل الدین عالی —— اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔

ٹرسٹ کی عملی سرگرمیوں کا آغاز اس وقت ہوا جب ٹرسٹ نے روزنامہ "مارننگ نیوز" ڈھاکہ اور کراچی خرید لیا۔ اس اخبار میں آدم جی کے حصے ڈیڑھ لاکھ کے اور خواجہ نورالدین کے حصے تقریباً سوا لاکھ کے تھے۔ آدم جی کے حصے اصل قیمت پر لئے گئے ہیں خواجہ نورالدین کے حصے تقریباً دس گنا زیادہ قیمت پر لئے گئے۔ ان کو یہ رعایت اس لئے دی گئی کہ اس وقت کے مرکزی وزیرِ اطلاعات، خواجہ شہاب الدین، ان کے بہنوئی



الفتح

# ۵۱ لاکھ کے چندے سے ملک کے دس بڑے اخبار ٹرسٹ کی تحویل میں لے لئے گئے

ہیں اور خواجہ شہاب الدین کا شمار ایوب خان کے مقربینِ خصوصی میں ہوتا تھا۔

اگست ۱۹۶۴ء میں پروگریسو پیپرز لمیٹڈ اور اس کے اخبارات روزنامہ "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کو چودھری ظہور الٰہی سے تقریباً ۶۱ لاکھ روپے میں خریدا گیا۔ یہ سودا ٹرسٹ کو بہت سستا پڑا۔ اس لئے کہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کا اثاثہ اس وقت بھی دو ڈھائی کروڑ سے کسی طرح کم نہ تھا اور اس کے دونوں اخبارات بھی ملک کے بااثر اور کثیر الاشاعت جرائد تھے۔ قومی صحافت میں ان کو ممتاز ترین مقام حاصل تھا۔

اس سودے کو ہفتہ بھر گزرا ہوگا کہ ٹرسٹ نے ۵۰ ہزار میں روزنامہ "مشرق" لاہور بھی خرید لیا۔ یہ سودا بھی چودھری ظہور الٰہی کے ہاتھوں ہوا لیکن یہ سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ "مشرق" کے ساتھ ۱۰ لاکھ کے قرضے کا بار بھی تھا۔ یہ پی پی ایل کا قرضہ تھا۔ ویسے بھی یہ سودا نامناسب تھا۔ "امروز" کی موجودگی میں "مشرق" کی خریداری کا کوئی جواز نہ تھا۔ دونوں اخبارات ایک ہی زبان کے تھے، ایک ہی شہر سے شائع ہوتے تھے اور دونوں میں معاصرانہ رقابت بھی تھی۔ بظاہر اس سودے کا کوئی سبب نظر نہ آتا تھا۔ سنا ہے کہ اس کا فیصلہ ٹرسٹ کے چیئرمین اختر حسین کے بجائے اس وقت کے گورنر مغربی پاکستان نواب کالاباغ مرحوم نے کیا تھا۔ اور یہ فیصلہ انہوں نے اس لئے کیا تھا کہ ان دنوں وہ چودھری ظہور الٰہی سے سخت ناراض تھے۔ انہیں کسی صورت یہ گوارا نہ تھا کہ ان کے کسی مخالف کے پاس اخبار ایسا موثر ہتھیار ہو جسے ان کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔

چند ہی مہینے بعد یعنی اکتوبر ۱۹۶۴ء میں روزنامہ "انجام" کراچی اور پشاور ۱۴ لاکھ میں حئی سنز سے خریدا گیا لیکن یہ رقم ان کو کبھی ادا نہ ہوئی۔ جب زیادہ مطالبہ ہوا تو وزیرِ خزانہ محمد شعیب نے اسے معاف کرا لیا۔ اس طرح روزنامہ "انجام" ٹرسٹ کو مفت ملا۔ ٹرسٹ کے قیام میں دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب انتخابات بھی تھے اور صدارتی امیدوار کی حیثیت سے محترمہ فاطمہ جناح کے سامنے آنے کے باعث نہ صرف انتخابات کی اہمیت بڑھ گئی تھی بلکہ ایوب خان کسی قدر پریشان بھی تھے۔ اخبارات سے وہ بہت ڈرتے تھے۔ پریس کو وہ طبقہ چہارم (FOURTH ESTATE) سمجھتے تھے۔ لہٰذا جوں جوں انتخابات کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی اخبارات کو حکومت کی تحویل میں لینے کی

**نیشنل پریس ٹرسٹ**
**ایوب خان اور اُن**
**کی حکومت کی**
**پروپیگنڈا مشنری**
**کا ایک حصہ بن گیا**

سرگرمیاں اسی قدر تیزی سے بڑھتی جا رہی تھیں۔ بہ حال ان اخبارات کی خریداری کے بعد مغربی پاکستان کی جانب سے وہ کسی حد تک مطمئن ہو گئے۔ لیکن مشرقی پاکستان میں صرف "مارننگ نیوز" ٹرسٹ کے پاس تھا۔ بنگلہ کا کوئی اخبار نہ تھا۔ لہٰذا نومبر ۱۹۶۴ء میں ڈیڑھ لاکھ کے سرمائے سے "دینک پاکستان" جاری کیا گیا۔ اس طرح ۵۱ لاکھ کے چندے اور نیشنل بنک کے قرضے سے ملک کے دس بڑے اخبارات ایوب خان کی انتخابی مہم اور ان کی حکومت کے تحفظ کے لئے ٹرسٹ کی تحویل میں آگئے۔

اخبارات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ جناب اختر حسین نے ٹرسٹ کے چارٹر کو بھی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک نہایت کارآمد منصوبہ تیار کیا۔ جس میں ایک وسیع لائبریری، صحافیوں کا تربیتی ادارہ اور تحقیقاتی مرکز کا قیام شامل تھا۔ ابھی اس منصوبے کا باقاعدہ آغاز بھی نہ ہوا تھا کہ مئی ۱۹۶۵ء میں اختر حسین کو ٹرسٹ سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑی۔ اس کی جو وجوہات سننے میں آئیں ان کے مطابق ایوب خان ٹرسٹ کے اخبارات کو اپنی حکومت کے پروپیگنڈے کے لئے جس طرح استعمال کرنا چاہتے تھے اختر حسین اس پر آمادہ نہ تھے۔ وہ ٹرسٹ کو کسی حد تک غیر جانبدارانہ کردار دینا چاہتے تھے اور اسے قومی ادارہ بنانا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی سبکدوشی کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ "مارننگ نیوز" کے سودے سے خواجہ نورالدین ناراض تھے۔ وہ سرے سے اس بات کے حق ہی میں نہ تھے کہ ان کے اخبارات ٹرسٹ کی تحویل میں دیئے جائیں۔ آخر انہوں نے "مارننگ نیوز" سے علیحدگی اختیار کر لی اور منیجنگ ڈائریکٹر کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ خواجہ شہاب الدین وزیرِ اطلاعات تھے اور رشتے میں خواجہ نورالدین کے بہنوئی ہیں لہٰذا وزارتِ اطلاعات بھی اختر حسین سے ناراض رہنے لگی۔ خواجہ شہاب الدین اس زمانے میں ایوب خان کے مشیر تھے۔ چنانچہ ایوب خان نے اختر حسین کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

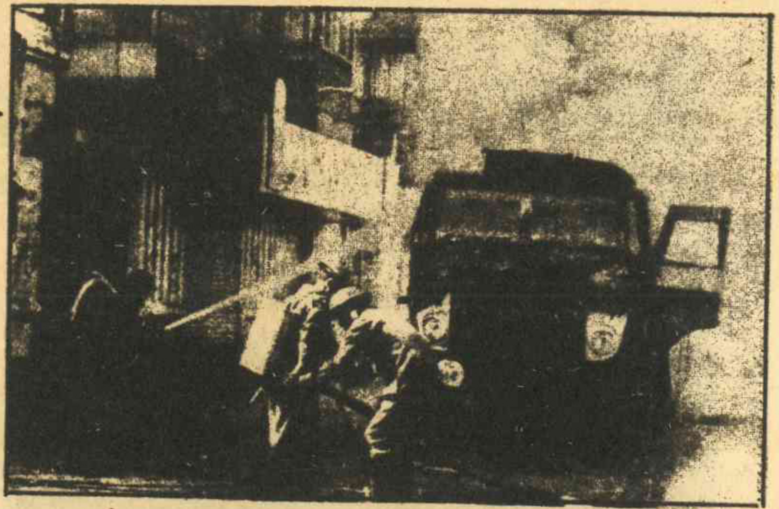
جناب اختر حسین کے بعد ٹرسٹ کے نئے چیئرمین میجر جنرل ضیاء الدین مقرر ہوئے مگر انہیں اس عہدے پر آئے ہوئے مہینہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ پی آئی اے کے حادثہ قاہرہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اگست ۱۹۶۵ء میں اے۔ کے سومار چیئرمین مقرر ہوئے۔ ان کے انتخاب پر لوگ چونکے بات بھی حیرت کی تھی۔ ان کا تعلق نہ کبھی انتظامیہ سے رہا تھا نہ صحافت سے۔ سنا ہے یہ انتخاب محمد شعیب کا تھا اور انہی کی سفارش پر یہ تقرر ہوا تھا

(باقی آئندہ)

اردو سندھی کا جھگڑا

# عوام کے خلاف نوکر شاہی

# اور جاگیرداروں کا نیا حربہ



**شاہد**

**صوبۂ سندھ** میں زبان کے مسئلہ نے ایک بار پھر سنگین صورت اختیار کرلی ہے۔ جھگڑا سندھی اور اردو کا ہے۔ آغاز اس کا اس وقت ہوا جب سندھ یونیورسٹی نے سندھی کو یونیورسٹی کی سرکاری زبان قرار دیا۔ اردو بولنے والوں کی جانب سے اس کا ردعمل احتجاج کی صورت میں نمودار ہوا جس نے کشیدگی کی صورت اختیار کرلی۔ اس کشیدگی کے نتیجے میں حیدرآباد میں سندھیوں اور مہاجرین کے درمیان فسادات ہوئے۔ لوٹ مار، آتش زنی اور خنجر زنی کے واقعات پیش آئے۔ لیکن یہ ہنگامے حیدرآباد تک محدود رہے۔ آگے نہ بڑھے اور کسی نہ کسی طرح ان پر قابو پا لیا گیا۔

جس جھگڑے کی ابتدا لسانی مسئلہ سے ہوئی تھی اس نے جلد ہی علاقائی منافرت کی شکل اختیار کرلی۔ یہ نفرت سندھیوں اور مہاجرین کے درمیان پیدا ہوئی۔ مہاجرین کے لئے نئے سندھیوں کے نام تجویز کیا گیا۔ لیکن نام بدلنے سے ہیئت نہیں بدل جاتی۔ مسئلہ جوں کا توں اپنی جگہ رہا۔ اسے حل کرنے کی سنجیدگی سے کوشش بھی نہیں کی گئی منافرت اندر ہی اندر پروان چڑھتی رہی۔ فضا پر کشیدگی طاری تھی۔ کہ اچانک حیدرآباد ثانوی بورڈ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ بورڈ کی سرکاری زبان بھی سندھی ہوگی۔ اردو والوں کی جانب سے اس کا ردعمل وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ جگہ جگہ اردو بولنے والے طلباء کی جانب سے بھوک ہڑتالیں ہونے لگیں۔ پھر ان بھوک ہڑتالوں کے ساتھ جلسے جلوس ہوئے۔ قراردادیں پاس کی گئیں۔ مظاہرے ہوئے۔ ان مظاہروں نے ہنگاموں کی صورت اختیار کرلی۔ پولیس اور مظاہرین کے ساتھ تصادم ہوئے۔ لاٹھی چارج ہوا۔ آنسو گیس پھینکی گئی اور جب حالات پر قابو نہ پایا جا سکا تو حیدرآباد میں فوج طلب کرنی پڑی۔

حیدرآباد میں اب امن و امان ہے مگر کشیدگی بدستور برقرار ہے۔ حیدرآباد اور نواب شاہ میں اردو کی حمایت میں طلباء کی بھوک ہڑتال جاری ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ افسوسناک صورت حال کیسے پیدا ہوئی اور کیوں ہوئی؟ اس کا پس منظر یہ ہے کہ سندھی کے بعض ادیبوں اور دانشوروں نے شیخ ایاز کی سربراہی میں "جئے سندھ" کی تحریک شروع کی۔ سکھر اور کراچی کے کچھ اور اہل قلم بھی ان کے ہمنوا بنے اور عوامی ادبی انجمن کے نام سے ایک جماعت قائم کی گئی۔ اس کے منشور میں اردو کو "رابطے کی زبان" قرار دیا گیا۔ اس پلیٹ فارم سے جو نعرے بلند کئے گئے ان میں سب سے دلچسپ نعرہ "اردو سامراج" کا تھا۔

"جئے سندھ" تحریک کا مقصد اور نصب العین اگر سندھی عوام کی خوشحالی اور بہتری ہے تو کسی محب وطن پاکستانی کو اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن "جئے سندھ" کا مقصد اگر "مرے مہاجر" اور "مرے پنجابی" ہے تو یہ علاقائی تعصب ہے اور قابل مذمت ہے۔ بدقسمتی سے "جئے سندھ" کے علمبرداروں نے اپنی تحریک کے اس پہلو کی نزاکت پر توجہ نہیں دی۔ اس تحریک کے بارے میں بدگمانیاں پھیلتی گئیں۔ اور ان کو رفع کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جناب جی ایم سید اور پیر علی محمد راشدی اسی زمانے میں متحدہ محاذ قائم کیا اور اس تحریک کو اپنے سیاسی مقاصد کا آلۂ کار بنایا۔ اس طرح کشیدگی اور بڑھی اور اس کے ردعمل میں "مہاجر پنجابی پٹھان متحدہ محاذ" وجود میں آیا۔ اگر سندھ متحدہ محاذ سندھ کے پرانے جاگیرداروں کا محاذ ہے تو مہاجر پنجابی پٹھان متحدہ محاذ نئے سندھی جاگیرداروں کا محاذ ہے۔ ایک محاذ کے سربراہ جی ایم سید ہیں تو دوسرے کے سربراہ نواب مظفر حسین ہیں۔ جھگڑا سندھی عوام کا نہیں، سندھی اور مہاجر کا نہیں، پرانے اور نئے جاگیرداروں کا ہے۔ عوام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ عوام کا رشتہ عوام ہی سے ہوتا ہے۔ کسان کا کسان سے اور مزدور کا مزدور سے۔ یہ معاشرے میں اقتصادی رشتے ہوتے ہیں اور انہی رشتوں کی بنیاد پر معاشرے میں افراد کی گروہ بندی ہوتی ہے۔ طبقات بنتے ہیں اور ان کے مشترکہ مفادات وجود میں آتے ہیں۔ خواہ وہ معاشی مفادات ہوں، سیاسی یا ثقافتی۔

لیکن "جئے سندھ" اگر عوامی تحریک ہے یا اگر اس کی بنیاد سندھ کے عوام کے معاشی، سیاسی اور ثقافتی مفادات پر ہے تو پھر متحدہ محاذ سے یہ تحریک کس طرح وابستہ ہو گئی۔ اور ایسی صورت میں جبکہ اس کے علمبردار اسے ایک ترقی پسند تحریک بتاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو دشمنی اس میں کس طرح داخل ہو گئی۔ اور یہی نہیں اردو زبان نے بڑھ کر اردو سامراج بن گئی۔ زبانیں تاریخ میں کبھی سامراج نہیں کہلاتیں۔ برطانوی سامراج یا امریکی سامراج تو سرمایہ داری

کی انتہاپسند شکل ہے۔ معاشی استحصال کی ایک منظم شکل ہے اور اردو تو اس ملک کے استحصالی طبقوں کی بھی زبان نہیں۔ راج سنگھاسن پر تو انگریزی ہی براجمان ہے۔

مسئلہ کی نوعیت اس وقت یہ ہے کہ سارا جھگڑا سندھی کو سرکاری زبان بنانے کا ہے۔ اس کی حامی "جیے سندھ" تحریک ہے۔ اس کے علمبردار خود کو سوشلسٹ بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ سوشلزم نہیں ہے۔ سندھی قومی کلچر اور سندھی سرکاری زبان دونوں غلط نعرے ہیں۔ لینن نے اپنے مضامین "قومی مسئلے پر" اور "کیا ایک لازمی سرکاری زبان ضروری ہے؟" میں ان نعروں کی اس انداز فکر کی اور اس تصور کی نہ صرف مذمت کی ہے بلکہ اسے رجعت پسندوں کا نعرہ قرار دیا ہے اسے بورژوا اور جاگیردار طبقے کی سازش کہا ہے۔

لینن کے اس حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کی بنیاد پر ہم اس بات کے بھی حامی ہیں کہ صرف اردو کو صوبہ سندھ کی سرکاری زبان قرار دیا جائے یا اردو بولنے والوں کی ثقافت کو سندھ پر نافذ کیا جائے۔ نہ زبانیں اس طرح نافذ ہوتی ہیں نہ ثقافت، زبانیں معاشرے کی نشو و نما کے ساتھ پھلتی اور بڑھتی ہیں۔ اور ان کا یہ عمل بالکل فطری ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس ارتقائی عمل کو زیادہ سے زیادہ بڑھنے اور پھلنے کا موقع دیا جائے۔

اس وقت زبان کا جو جھگڑا ہے وہ بنیادی طور پر عوام کا مسئلہ نہیں، یہ نوکرشاہی کا مسئلہ ہے۔ پاکستان میں برطانوی نوآبادکاروں کی پروردہ نوکرشاہی کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ انگریزی سرکاری زبان کی حیثیت سے مسلط رہے۔ انگریزی کے اس تسلط کے ساتھ اس کا معاشی مفاد وابستہ تھا۔ لیکن جب یہ نوکرشاہی کمزور پڑ گئی اور نیا تعلیم یافتہ طبقہ ابھرا جو اس کا جانشین بن سکتا تھا تو اس نے اپنے معاشی مفاد یعنی ملازمتوں کے لئے علاقائی زبانوں کو آلہ کار بنانا شروع کر دیا۔

اگر صورت حالات کا سائنٹیفک تجزیہ کیا جائے تو جھگڑا اس بات کا نہیں ہے کہ سندھی اور اردو کو کس طرح فروغ دیا جائے بلکہ جھگڑا یہ ہے کہ صوبہ سندھ کی انتظامیہ اور تعلیمی اداروں میں جو آسامیاں خالی ہو رہی ہیں اسے کون حاصل کرے۔ سندھی والے چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ملازمتیں ان کے حصے میں آئیں اور اردو والے سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے حقوق سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ خالص معاشی جھگڑا ہے اور ایک مخصوص گروہ کا جھگڑا ہے اور یہ مسئلہ نہ جی ایم سید حل کر سکتے ہیں اور نہ نواب مظفر حسین جو اردو کا سربراہ کہلاتے ہیں۔

یہ نواب مظفر حسین کون ہیں؟ ماہر تعلیم ہیں ادیب ہیں، شاعر ہیں، دانشور ہیں، ماہر لسانیات ہیں؟ یہ بزرگوار سندھی اور غیر سندھی کی منافرت میں قومی اسمبلی کے رکن بن گئے، سیاسی رہنما بن گئے اور جب کوئی سیاسی رہنما بن جاتا ہے تو وہ ہر قومی مسئلے کا اجارہ دار بن جاتا ہے اردو کی بدقسمتی اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ اس کی سربراہی نواب مظفر حسین کر رہے ہیں جو مرتی ہوئی جاگیردارانہ تہذیب کے نمائندے ہیں ان کا طبقاتی کردار اس بات کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ لسانی مسئلہ کو عوامی نقطۂ نظر سے حل کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اردو کی عنان رہی تو مسئلہ سلجھنے کی بجائے اور الجھے گا مسئلہ الجھے گا تو کشیدگی بڑھے گی۔ منافرت پھیلے گی

باقی صفحہ ۴۲ پر








## چھ نکات کے حصے پر وہ اب ایمان لے آئے ہیں

افضل صدیقی

بساطِ سیاست کے بڑے بڑے نامور شاطر اور اقتدار کی دوڑ میں ہمیشہ اول آنے والے بڑے بڑے کھلاڑی الیکشن کے اکھاڑے میں چاروں شانے چت جاگرے۔ سیاست اور مذہب پر ایک ربع صدی سے جن جغادریوں کی اجارہ داری قائم کی تھی وہ دیکھتے ہی دیکھتے ملیامیٹ ہو گئی۔ بڑے بڑے عیار، زمانہ ساز پھینکت اور چومکھی لڑنے والے الیکشن باز جو پاکستان کے ہر سیاسی منظر پر چھاتے رہے ایسے ڈھیر ہوئے کہ ابھی تک پڑے ہانپ رہے ہیں۔ ایسے ہی بزرگوں میں پیر علی محمد راشدی کا دم بڑا غنیمت تھا۔ وہ سیاست اور صحافت سے وزارت، سفارت اور امارت تک پہنچے۔ پیری مریدی کا شغل تو خیر جدّی پشتی ہے جو ان کے بعد بھی غالباً چلے گا۔ جب علی محمد راشدی جوان تھے تب بھی پیر تھے۔ اور اب پیرِ ناتواں ہونے پر بھی پیر ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ڈبل پیر ہیں۔ ڈبّہ پیر نہیں۔ اسی خالص پیری کے طفیل انہیں الیکشن میں ہزاروں ووٹوں سے پچھاڑ کھانی پڑی اور وہ بھی اس سے جو عمر میں ان جیسا پیر بالغ نہیں تھا۔ پیر صاحب سے وزارت سفارت چھنی تو پھر کوچۂ صحافت میں لوٹ آئے۔ اور ایک مقامی اخبار میں جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگے۔ اہلِ کرسی پر خوب خوب تبرّے بھیجے۔ آمریت کو حسبِ خیش گالیاں دے کر ... قومی اور بین الاقوامی سیاست کے پہاڑوں سے ہوتے ہوتے سندھ کی ترائی میں اُتر آئے۔ دنبال تو یہیں گرا تھا۔ خود ون یونٹ کے سب سے بڑے مبلغوں میں سے تھے۔ ون یونٹ توڑنے والوں میں بھی پیش پیش رہے۔ اپنے قلم سے ہوا کا رُخ اِدھر سے اُدھر کرنے میں ماہر مانے جاتے ہیں۔ الیکشن سے پہلے اسلام اور نظریۂ پاکستان کے سب سے بڑے حامی اور علمبردار ہونے کا ثبوت فراہم کرنے میں انہوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لوگوں کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ وہ ایک اخبار کو جو اُن کا اپنا نہیں ہے، اپنی الیکشنی مہم کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ خود اس اخبار کے مالک کو بھی نہ ہو سکا۔ ون یونٹ پر، سندھ کی سیاست پر، اسلام پر، نظریہ پاکستان پر انہوں نے جی بھر کے لکھا۔ اپنی دانست میں انہوں نے بہت بڑا کام کر ڈالا تھا۔ الیکشن میں کھڑے ہونے کی دیر تھی کہ ووٹ آپ ہی آپ ان کی جھولی میں گرنے لگتے۔ زور انہوں نے کچھ ایسا ہی باندھا تھا اور کامیابی کا اس قدر پختہ یقین تھا کہ انہوں نے تین مسلم لیگوں میں سے کسی کا بھی ٹکٹ لینے کی ضرورت محسوس نہ کی حالانکہ وہ پیدائشی مسلم لیگی سمجھے جاتے ہیں۔ آخر وقت تک انہیں پتہ نہ چل سکا کہ جن مریدوں کے وہ پیر ہیں وہ ان کے حلقۂ ارادت سے نکل چکے ہیں اور پھر وہی ہوا جو ہونا تھا اور جس سے وہ بے خبر تھے۔

الیکشن میں شکست کھانے اور شکست کا یقین آجانے کے درمیان کوئی ایک ماہ کا وقفہ رہا۔ اس وقفہ کے اختتام پر انہوں نے اسی کثیر الاشتہارات اخبار میں پھر سلسلۂ مضامین شروع کیا۔ مشرق و مغرب اور ون یونٹ کے دل پسند موضوعات ترک کر کے انہوں نے بڑے بھاری دل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کی یہ تازہ تخلیق تضاد بیانی کا شاہکار ہے۔ مضمون پڑھ کر ان پر بہت رحم آیا۔ آدمی اس قدر مجبور اور بیچارہ بھی ہو سکتا ہے اس کا اندازہ یہ مضمون پڑھ کر ہوا اور نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی ان کی طبیعت سنبھلی۔ فرماتے ہیں۔ "میں آج بھی اپنی ناکامی کی وجہ سے اپنے دل میں کوئی تکدّر یا تلخی نہیں پاتا ہوں۔" مگر اس کے فوراً بعد انہوں نے پیپلز پارٹی کو بے نقطہ سنا ڈالی ہیں اور پارٹی کے چیئرمین جناب بھٹو کو عورتوں کی طرح گود پھیلا پھیلا کر کوستے ہوئے ہیں طنز و تشنیع کے تیر چلانے اور جلی کٹی سنانے کے بعد انہوں نے انتخابات میں حصہ لینے کا واحد سبب یہ بیان کیا ہے

"ان انتخابات میں شرکت کا اصلی سبب یہ تھا کہ یہ خاکسار نظریۂ پاکستان کی ولادت کے وقت موجود رہا تھا اور اب جب اس برخوردار کی میّت اٹھ رہی تھی تو اس کو کاندھا نہ دینا اور اس کے سوگواروں کی جماعت میں شامل نہ ہونا وضعداری کے خلاف تھا۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ پیر صاحب سوگواروں کی جماعت اسلامی میں شامل تھے۔ نظریۂ پاکستان کی ولادت کے وقت وہ خاکسار مسلم لیگی تھے اور انتخابات کا موسم آیا تو "آزاد" ہو گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ پیر صاحب الیکشن سے پہلے ہی نظریۂ پاکستان کو اپنے ہوتے ہوتے مردہ سمجھ بیٹھے تھے اور اب اس کی میّت اٹھتی دیکھ کر کاندھا دینے کے لئے الیکشن میں آن کودے تھے گویا انہیں اپنا حشر پہلے ہی معلوم تھا لیکن وضعداری نبھانی تھی لیکن اس کے فوراً ہی بعد لکھتے ہیں: "جہاں تک انتخابات کے عام نتائج کا تعلق ہے وہ یقیناً غیر متوقع اور انقلاب بداماں ثابت ہوئے۔"

بتایئے قارئینِ گرامی! ان دونوں دعووں میں باہم کوئی مطابقت ہے؟ ایک طرف تو وہ الیکشن سے پہلے نظریۂ پاکستان کی میّت اٹھتے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے الیکشن لڑتے ہیں اور دوسری طرف ایک ہی سانس میں انتخابات کے نتائج کو غیر متوقع اور انقلاب بداماں

# پیر جی! لمبی تان کر سو جائیے، قوم اب جاگ اٹھی ہے

کہہ دیتے ہیں۔ یعنی خود انہیں الیکشن سے پہلے ان نتائج کی توقع نہیں تھی۔ جب یہ توقع نہیں تھی تو نظریۂ پاکستان کا مردہ کیسے نظر آگیا۔ یقیناً دونوں میں سے کوئی ایک دعویٰ غلط ہے۔ کونسا صحیح ہے اور کونسا غلط۔ اس کا انتخاب بھی پیر صاحب ہی پر چھوڑ دیتے آگے چل کر فرماتے ہیں؛

"سوشلسٹوں نے سب سے اوّل تو اپنی حکمتِ عملی اور بعد کی اپنی کامیابی سے جو مقام پہلے مذہب کو حاصل تھا اب وہ اقتصادیات کو دے کر دیدیا ہے"

حضرت پیر علی محمد راشدی صاحب کی مذہب سے مراد اسلام ہے تو حیرت ہے کہ پیر صاحب جیسا مبلغِ اسلام دین کو مذہب کہتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی آخری آیت شاید پیر صاحب کو یاد نہیں رہی ورنہ وہ اسلام کو محض مذہب نہ کہتے۔ مصلّے پر بیٹھ کر ساڑھے سات روپے سیر کا گوشت کھانے والوں اور ڈیڑھ روپے سیر کا دودھ نما پانی پینے والوں کو کیا خبر کہ ننگی زمین پر سونے والے صرف ایک وقت دال روٹی کھانے والے یا سوکھے چنے کھا کر خدا کا شکر ادا کرنے والے مسلمان اپنے دین سے کتنے باخبر ہیں۔ انہیں نظریۂ پاکستان کا جنازہ نکالنے کی فرصت ہی کہاں ہے۔ استحصال پسند اور دولت کی عبادت کرنے والے زمیندار کو کیا معلوم کہ اس کا غلام ہاری بظاہر تو اس کے آگے سر جھکاتا ہے مگر اللہ کو یاد پانچوں وقت کرتا ہے اور رمضانِ مبارک ہی میں نہیں بلکہ سال کے چھ مہینے روزے رکھنے پر مجبور ہے۔ اس کے نزدیک اسلام متنازعہ فیہ مسئلہ نہیں سہا۔ جو مسلمان ہیں وہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ ایک ہے قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں۔ وہ کوئی کافر ہی ہوگا جو ایک مسلمان کے اس یقین پہ شک کرے۔ اسلام کے لئے کون لوگ آپس میں دست بگریبان رہے ہیں۔ پیر صاحب کو ان کا اچھی طرح علم ہے جبھی تو وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں؛

"الیکشن سے یہ بھی ظاہر و باہر ہے کہ مولوی صاحبان کو کسی باہر کے دشمن کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایک دوسرے کو خود ہی ختم کرنے والے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے یہ بزرگ اس مرتبہ اپنے ساتھ اسلامی نظریۂ حیات کو بھی گھسیٹ کر لے گئے۔"

بیان میں یہ تضاد ملاحظہ فرمایا آپ نے "ظاہر و باہر" والی ادعا سے قطع نظر ایک طرف تو پیر صاحب نظریۂ پاکستان کا جنازہ نکالنے کا الزام سوشلسٹوں پر دھرتے ہیں کہ انہوں نے اقتصادیات کو "اول" اور مذہب کو دوم مقام دیا اور دوسری طرف مولوی صاحبان پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ اسلامی نظریۂ حیات کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے گئے۔ کیا پیر صاحب کی نظر میں "نظریۂ پاکستان" اور "اسلامی نظریۂ حیات" دو الگ الگ نظریے ہیں؟ اگر وہ دونوں کو ایک ہی نظریہ سمجھتے ہیں تو پھر اس نظریہ کا جنازہ نکالنے والے کون لوگ ہوئے؟ خود ہی برملا دعویٰ کرنا اور فوراً خود ہی اپنے دعوے کی تردید کر دینے کا ہنر کوئی پیر صاحب سے سیکھے۔ ستم یہ ہے کہ وہ اب بھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کے مرید ان کی ان متضاد سنہری مندیوں پر پہلے کی طرح ایمان لے آئیں گے۔ پیر صاحب کو اسی پر قانع رہنا چاہیے کہ ان کی تضاد بیانیوں کو ہوا دینے کے لئے ایک بڑا اخبار موجود ہے ؎

عمرش دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

سارے مضمون میں پیر صاحب نے الیکشن کے نتائج سامنے رکھ کر اس کا ماتم کیا ہے کہ پاکستانیوں نے اسلام کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا اور جس بنیاد پر پاکستان کی عمارت تعمیر ہوئی تھی وہ ختم کر دی۔ اپنے مضمون میں انہوں نے یہی لکھا ہے۔

"پاکستان کے عوام نے اپنی زندگی کا محور یا مرکزِ ثقل مذہب کی جگہ پر اقتصادیات کو قرار دے دیا ہے تو اس صورت میں وہ بنیاد ختم ہو گئی جس پر برِ صغیر کا بٹوارہ ہوا تھا۔"

جب بنیاد ہی ختم ہو گئی تو پاکستان کہاں سلامت رہا۔ جی نہیں۔ بنیاد ختم ہونے کے باوجود قائم ہے۔ لکھتے ہیں؛

"چھ پائنٹ کی بناء پر آئین بنا تو اس سے نئے حالات میں پاکستان ٹوٹے گا نہیں بلکہ ٹوٹنے سے محفوظ رہ جائے گا۔"

"مجیب صاحب کے چھ پوائنٹ سے صرف بنگال ہی مستفید نہیں ہوگا بلکہ ان پائنٹوں کا اطلاق انتقالِ اختیار کے بارے میں مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں پر بھی ہوگا یعنی وہی اختیارات پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کو مل جائیں گے۔"

یہ ارشادات شیخ مجیب الرحمٰن کے نہیں بلکہ اس شخص کے ہیں جو مجیب الرحمٰن اور ان کی پارٹی کے بڑے دشمنوں میں گنا جاتا تھا۔ الیکشن کا نتیجہ آتے ہی یہ ایک دم کایا پلٹ کیسے ہو گئی؟ پیر صاحب نے کسی زمانے میں چھ نکات کے خلاف اپنا تمام زورِ قلم صرف کر دیا تھا۔ اب وہ چھ نکات کو پاکستان کی نئی بنیاد تسلیم کر رہے ہیں ؎

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

پیر صاحب نے اپنے قلم سے بارہا لکھا ہے۔ کہ چھ نکات پاکستان کے وجود کے لئے مہلک ہیں۔ بارہا انہوں نے یہ تحریر کیا کہ چھ نکات پر عملدر آمد سے مشرقی پاکستان الگ ہو جائے گا۔ قومی یکجہتی کا تصور ہی ختم ہو جائے گا اور وہ بنیاد ہی دم توڑ دے گی جس پر پاکستان بنا تھا۔ مگر وہی قلم یہ لکھتا ہے کہ چھ نکات سے پاکستان ٹوٹے گا نہیں بلکہ ٹوٹنے سے محفوظ رہ جائے گا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو انہوں نے ماضی میں کن کن گالیوں سے نہیں نوازا۔ پیر صاحب سمجھتے ہیں کہ یہ ماضی بعید کی باتیں ہیں لوگ بھول گئے ہوں گے۔ جی نہیں یہ ان کی اپنی بھول ہے۔ اسی بھول ہی نے تو انہیں الیکشن میں پچھاڑ دیا۔

باقی صفحہ ۴۱ پر

احوال واقعی

# آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں....

منہاج برنا

**حنیف رامے نے اسلام پسندوں کو بغلیں بجانے کا موقع فراہم کر دیا**

دائیں بازو کے اخبارات اور رجعت پسند سیاسی عناصر روزنامہ "مساوات" کے ۱۶ جنوری کے اداریے کو خوب خوب اچھال رہے ہیں۔ سوموار کے اخبار "امروز" نے تو اس کا پورا متن اپنی ۱۷ جنوری کی اشاعت میں جلی حروف میں شائع کیا اور تین کالمی سرخی جمائی کہ "مساوات کے ایڈیٹر نے اخبار کو معنوی گھیراؤ سے نکال لیا" معنوی گھیراؤ کا مطلب تو دربطن ایڈیٹر ہوگا۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ مسٹر حنیف رامے کے اس اداریے پر امروز نے خوب خوب بغلیں بجائیں۔ مجید نظامی کے "ندائے ملت" کی باچھیں بھی ۲۰ دسمبر کے بعد سے مسلسل سکڑی ہوئی تھیں یک لخت کھل گئیں۔ اور بھی بہت سے پسندوں کے دل باغ باغ ہوئے۔

۱۶ جنوری کا اداریہ بعنوان "جدوجہد اور تنظیم" مسٹر حنیف رامے نے اپنے دستخط کے ساتھ یعنی بقلم خود تحریر فرمایا ہے اور اس کا مقصد جیسا کہ اس کے متن سے ظاہر ہے پیپلز پارٹی کے ان چار رہنماؤں یعنی صوبائی اسمبلی کے منتخب رکن مسٹر عبدالحفیظ کاردار اور قومی اسمبلی کے منتخب ارکین مسٹر مختار رانا، مسٹر احمد رضا قصوری اور میاں حامد یٰسین کی مذمت کرنا ہے جنہوں نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ (پی پی ایل) کے صحافیوں اور دیگر کارکنوں کی حالیہ جدوجہد میں ان کا ساتھ دیا تھا اور بھوک ہڑتال کی تھی۔

مساوات پاکستان پیپلز پارٹی کا ترجمان سمجھا جاتا ہے اس لئے اس میں جو تحریر ہوتا ہے اسے نہ صرف پارٹی کے ارکان بلکہ عام لوگ بھی جو اس کے مجموعی مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور خاص طور سے اس کے اداریوں کو تو پارٹی اور اس کی قیادت کی عمومی حکمت عمل کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ مجید نظامی جیسے لوگ مساوات کو پیپلز پارٹی کا "پراودا" قرار دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۶ جنوری کے اداریے کو جب لوگوں نے پڑھا تو وہ ششدر رہ گئے کہ آخر ماجرا کیا ہے یہ کون سے حنیف رامے ہیں جو مسٹر کاردار اور ان کے دوسرے رفقاء کو "موقع پرست" کے لقب سے یاد کر رہے ہیں۔ کیا یہ وہی ہیں جنہوں نے ۱۰ جنوری کو جب صفدر میر نے اپنا مرن برت شروع کیا تھا پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو مشورہ دیا تھا کہ "وہ گلی گلی کوچے کوچے صفدر میر کا پیغام پہنچا دیں۔ صفدر میر پاکستان کے غریب عوام کا زندہ قلم ترجمان ہے اور پاکستان کے تیرہ کروڑ عوام اپنے ترجمان کے ساتھ جیئیں گے۔ اور اس کے ساتھ مریں گے۔ یہ ہڑتالی کیمپ ہمارا پہلا مورچہ ہے۔ فتح ہمارا مقدر ہو چکی ہے۔ ہمیں یہ جنگ جیتنا ہے۔ جیتنا ہے، جیتنا ہے"

ذرا غور فرمائیے کہ صفدر میر کے جس پیغام کو گلی گلی کوچے کوچے پہنچانے اور جس کے لئے تیرہ کروڑ عوام کی طرف سے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ وہ کیا تھا۔ یہی نا کہ پی پی ایل کے مظلوم صحافیوں اور کارکنوں کے مطالبات جائز ہیں اور انہیں تسلیم کیا جانا چاہیئے اور ان کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے خواہ اس مشن کی تکمیل میں جام شہادت ہی کیوں نہ پینا پڑے۔

لیکن چند روز کے اندر یہ کیا انقلاب رونما ہوا کہ وہی حنیف رامے جو تیرہ کروڑ عوام کو مورچہ لگانے کی ترغیب دے رہے تھے، ۱۶ جنوری کی تاریخ میں اپنی پارٹی کے ان رہنماؤں کو جو صفدر میر کے مورچہ پر ڈٹ گئے تھے "موقع پرست" قرار دے رہے ہیں۔ وہ بھی زبانی نہیں تحریری طور پر۔

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

آئیے ذرا اس اجمال کا تفصیلی جائزہ لیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، یعنی جہاں تک پی ایف یو جے اور پی پی ایل کے ملازمین کا تعلق ہے ہم سب "مساوات" اور اس کے ایڈیٹر حنیف رامے دونوں کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اور صرف پی پی ایل اور پی ایف یو جے ہی پر کیا منحصر ہے۔ تمام جمہوریت پسند اور عوام دوست عناصر مساوات اور شہاب کے شکر گزار ہیں کہ ان دو اخبارات نے اپنے اجرا کے بعد دائیں بازو کی رجعت پسند طاقتوں پر بھرپور وار کئے اور انہیں بے نقاب کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس اعتبار سے ظاہر ہے کہ ہر محب وطن مساوات اور اس کے ایڈیٹر کی مساعیٔ جمیلہ کا احسان مند ہے۔

لیکن افسوس کہ اس ایک اداریہ نے حنیف رامے

# 'ہڑتالی کیمپ ہمارا پہلا مورچہ ہے، فتح ہمارا مقدر ہو چکی ہے'

صاحب کے کئے دھرے پر پانی پھیر کر رکھ دیا ہے۔ کیونکہ اداریۂ مذکور نہ صرف پیپلز پارٹی کے ان رہنماؤں اور کارکنوں کے ساتھ کھلی ہوئی ناانصافی ہے جنہوں نے پی پی ایل ورکرز یونین اور اس کے صدر صفدر میر کے آدرش کے لئے بھوک ہڑتال کی اور اپنی جان کی بازی لگا دی بلکہ بالواسطہ طور پر یہ پی پی ایل ورکرز یونین اور اس کے صدر صفدر میر پر بھی ایک حملہ کی حیثیت رکھتا ہے، وہی صفدر میر جو حنیف رامے کا "ویر" تھا۔ کیونکہ اگر حفیظ کاردار، مختار رانا، احمد رضا خاں اور میاں حامد یٰسین صفدر میر کی اپیل پر بھوک ہڑتال کر کے اور مطالبات کی تکمیل تک بھوک ہڑتال جاری رکھ کر "موقع پرست" قرار پا سکتے ہیں تو پھر صفدر میر کو کن القاب سے یاد کیا جائے گا۔ جس نے اس جہاد کی ابتدا کی اور جو حفیظ کاردار اور ان کے رفقاء کی حوصلہ مندی اور عوام دوستی کو ہدیۂ تحسین پیش کرتا ہے، اور خود حنیف رامے صاحب اپنی ذات کے لئے کون سا لقب تجویز کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے ۱۰ جنوری کو پی پی ایل ورکرز یونین کے اہتمام میں نکالے جانے والے اس جلوس میں شرکت کی تھی جو بھوک ہڑتال کی تحریک کی حمایت میں نکالا گیا تھا اور جس میں حنیف رامے صاحب کے علاوہ پنجاب اور بہاولپور کی پیپلز پارٹی کے چیئرمین شیخ رشید بھی موجود تھے۔ اور جلوس کے اختتام پر بھوک ہڑتالی کیمپ کے سامنے جو جلسہ منعقد ہوا اس سے بھی پارٹی کے وائس چیئرمین میاں محمود علی قصوری، شیخ رشید اور خود انہوں نے خطاب کیا تھا۔

"اس موقع پر پی پی ایل کے ملازمین کے مطالبات کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے جناب قصوری صاحب نے پی پی ایل کے مسئلہ کو ایک قومی مسئلہ قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ "پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کا معاملہ قومی اہمیت کا حامل ہے، اس مسئلہ کا حل افسروں کے بس کی بات نہیں۔ اور صدر پاکستان آغا محمد یحییٰ خاں کو چاہیئے کہ وہ بذاتِ خود اس معاملہ میں مداخلت کر کے اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل دیں۔"

(ملاحظہ ہو مساوات مؤرخہ ۱۲ جنوری ۱۹۷۱ء کا صفحہ ۸)

پنجاب پارٹی کے چیئرمین جناب شیخ رشید صاحب نے کہا تھا: "ہر وہ لمحہ جو غریبوں کے حقوق کے حصول میں صرف ہو جائے غنیمت ہے۔ صفدر میر کا جذبہ انقلابی جذبہ ہے۔ اور پاکستان کا ہر انقلابی اس جذبہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے صفدر میر کے ساتھ مر مٹنے کو تیار ہے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو اس جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی تلقین کی"

(ملاحظہ ہو مساوات، مؤرخہ ۱۲ جنوری ۱۹۷۱ء صفحہ ۸)

لیجئے شیخ رشید صاحب، صفدر میر اور پی پی ایل ملازمین کے جذبہ کو انقلابی قرار دیتے ہیں اور اس کے لئے "مر مٹنے" کو تیار ہیں، یہی نہیں بلکہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو بھی تلقین کرتے ہیں کہ اس تحریک میں "بڑھ چڑھ کر حصہ لیں"۔ اب ذرا جناب حنیف رامے صاحب لہجہ ملاحظہ فرمائیے۔ کتنا اچھوتا اور بانکا ہے۔ پی پی ایل کی بھوک ہڑتال کی تحریک کی حمایت کرتے ہوئے قصوری صاحب اور شیخ رشید دونوں کو میلوں پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ پھر تقریر بھی پنجابی میں کی تھی۔ جس نے سنا وہ عش عش کر اٹھا۔ ۱۲ جنوری کے مساوات کے ایشو میں ان کی تقریر صفحہ دو پر اس طرح رپورٹ کی گئی کہا: "پاکستان پیپلز پارٹی کی اصولی کمیٹی کے رکن اور صوبائی اسمبلی کے منتخب ممبر جناب حنیف رامے نے پیپلز پارٹی لاہور کے کارکنوں سے کہا ہے کہ وہ گلی گلی کوچے کوچے پھیل کر اعلان کر دیں کہ پیپلز پارٹی پی پی ایل

## کیا کاردار، احمد رضا قصوری، مختار رانا اور حامد یٰسین، موقع پرست ہیں؟

ورکرز یونین کے ساتھ ہے اور یونین کے مطالبات منوا کر دم لے گی۔ انہوں نے پی پی ایل کے کارکنوں کی حمایت میں نکالے جانے والے جلوس کے اختتام پر مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بھوک ہڑتال صفدر میر نے نہیں کی بلکہ محنت کش عوام کے ایک شیر دل ترجمان نے کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ان کے ساتھ ہیں اور ان کے ساتھ رہیں گے، یہ بھوک ہڑتالی کیمپ ہمارا پہلا مورچہ ہے اور اسے ہم ضرور فتح کریں گے، جناب رامے نے جو پنجابی میں تقریر کر رہے تھے کہا کہ میرے ویر صفدر میر نے سر پر کفن باندھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے سہرا باندھا ہے۔ صفدر میر کی بارات میں تیرہ کروڑ پاکستان کے عوام شامل ہیں جو اپنے حقوق کی دلہن بیاہنے جا رہے ہیں۔ پاکستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ صفدر میر کی بھوک ہڑتال پاکستان بھر کے فاقہ کش محنت کشوں کے حقوق کے لئے ہے"۔

دیکھا آپ نے شیخ رشید، میاں محمود علی قصوری اور سب سے بڑھ کر حنیف رامے صاحب نے صفدر میر اور پی پی ایل ورکرز یونین کی بھوک ہڑتال کی تحریک کی حمایت میں کتنی جذبات آفریں اور پُر اثر تقاریر کی ہیں۔ خطابت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ (اور پھر "از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق یہ باتیں سننے والوں کے دلوں میں کیوں نہ گھر کرتیں۔ اور سننے والوں میں عبدالحفیظ کاردار بھی تھے اور پیپلز پارٹی کے دوسرے سینکڑوں کارکن بھی۔

یہی نہیں بلکہ ۱۲ جنوری کے مساوات کے اداریہ میں جبکہ عبدالحفیظ کاردار کو بھوک ہڑتال کئے پانچ روز ہو چکے تھے اور ان کے ساتھ پیپلز پارٹی کے تین اور رہنما اور قومی اسمبلی کے منتخب اراکین یعنی میاں حامد یٰسین، مسٹر احمد رضا خاں قصوری اور مسٹر مختار رانا شامل ہو چکے تھے نہ صرف پی پی ایل کے عملہ کی تاریخی تحریک کا خیر مقدم کیا گیا تھا بلکہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس تحریک کی قیادت جائز طور پر پیپلز پارٹی نے سنبھال لی ہے۔ ذرا اداریئے کے الفاظ ملاحظہ کیجیئے۔

"... نادم تحریر ہمارے لئے یہ کہنا مشکل

# میاں محمود علی قصوری نے پی-پی-ایل کو قومی مسئلہ قرار دیا تھا

ہے کہ تصفیہ کی آخری شکل کیا ہوگی۔ مگر ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہوگا وہ جناب صفدر میر اور ان کے ساتھیوں کی رضامندی سے ہوگا۔ کیونکہ یہ مورچہ دراصل ان کا ہے اور وہی اس کا فیصلہ کریں گے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے اس کی قیادت سنبھال لی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محنت کشوں کے تمام مورچوں کو اپنے مورچے سمجھتی ہے۔ جناب حفیظ کاردار، جناب احمد رضا خاں قصوری، جناب حامد یسین، اور ذیلی تنظیموں کے متعدد عہدیداروں کی بھوک ہڑتال میں شرکت پارٹی کے عمومی سیاسی عمل اور مزاج اور منشور کے معاہد سے کیمطابق ہے۔"

ملاحظہ کیا آپ نے کہا گیا ہے کہ اس تحریک کی قیادت پیپلز پارٹی نے اختیار کر لی ہے اور یہ کہ بھوک ہڑتال میں پارٹی کے صوبائی اور قومی اسمبلی کے ارکان اور دوسرے عام ممبروں کی شرکت پارٹی کے مزاج اور منشور کے عین مطابق ہے:

ان تمام حقائق کے بعد مسٹر حنیف رامے کی جانب سے ۱۷ جنوری کے اداریہ کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے۔ مذکورہ اداریہ ہی مندرجہ ذیل نکات اٹھائے گئے ہیں۔

(۱) موقع پرستی کی مثال یہ ہے کہ کچھ سرکردہ کارکنوں نے پارٹی سے مشورہ کئے بغیر بھوک ہڑتال کے سلسلہ کا آغاز کر دیا ہے جو ایک نازک موڑ پر ختم نہ کیا جاتا تو عوام اور فوج کے درمیان ٹکر ہو جاتی۔

(۲) جہاں پارٹی کو باہر سے ردِّ انقلاب کا خطرہ ہوتا ہے وہاں اپنے اندر سے موقع پرستی کا ڈر بھی ہوتا ہے۔

(۳) انقلاب برپا کرنے والی پارٹی کے اندر موقع پرست لوگ اپنی ذات کو چمکانا اور ابھارنا شروع کر دیتے ہیں ......... سچی انقلابی پارٹی کا کام انقلاب کی ٹپاری کا ڈھکنا اٹھا دینا نہیں انقلاب کے درخت کی جڑیں اگانا ہے۔"

(۴) پارٹی کو ہر حال میں عوام کا ساتھ دینا ہے اور ان کے حقوق کے لئے بڑھ چڑھ کر کام کرنا ہے صرف اس طرح عوام کی قیادت پارٹی کے ہاتھ میں رہ سکتی ہے۔ البتہ اب ہمیشہ سے زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ جدوجہد کے پیچھے تنظیم اور تحریک کے پیچھے تدبیر موجود ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ ۱۲ جنوری تک جب مسٹر کاردار اور ان کے ساتھیوں کو بھوک ہڑتال کئے پانچ دن ہو چکے تھے، نہ پارٹی کی اجازت اور مشورہ کا سوال اٹھا تھا، نہ عوام اور فوج کے درمیان "ٹکر" کا اندیشہ پیدا ہوا تھا۔ بلکہ خود حنیف رامے صاحب گلی گلی محلے محلے مورچے لگانے کی بات کر رہے تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ اس کا بھی اعلان کر رہے تھے کہ تحریک کی قیادت جائز طور پر پارٹی نے اختیار کر لی ہے۔ کوئی ان سے مؤدبانہ سوال کرے کہ حضور یہ کیا ماجرا ہے کہ ۱۲ تاریخ تک مطالبات جائز، تحریک جائز، بھوک ہڑتال جائز اور یہ بھی طے کہ قیادت پارٹی کر رہی ہے۔ لیکن تین دن کے بعد آپ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ مسٹر کاردار اور پارٹی نے دوسرے سرکردہ کارکنوں نے پارٹی سے مشورہ کئے بغیر بھوک ہڑتال میں شرکت کی اس لئے وہ سب "موقعہ پرست" ہیں۔ اور اپنی ذات کو چمکا کر "ردِ انقلاب" "COUNTER-REVOLUTION"

> **جو شخص عوامی**
> **جدوجہد میں آگے**
> **بڑھ کر حصّہ لے گا**
> **اُس کی ذات بھی**
> **دوسروں کے مقابلے میں**
> **زیادہ چمکے گی۔**

کے ملزم قرار پائے ہیں۔ جناب حنیف رامے صاحب کے تجزیے سے تو یہی ثابت ہوگا کہ ہر وہ شخص جو عوامی جدوجہد میں اگوائی کرے موقع پرست ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لازم ہے کہ جب ایک شخص عوامی جدوجہد میں آگے بڑھ کر حصہ لے گا تو خواہی نخواہی اس کی ذات بھی دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ چمکے گی۔

بہتر ہوتا کہ حنیف رامے صاحب "پارٹی سے اجازت اور مشورہ" کی وضاحت کر دیتے اور یہ بھی بتا دیتے کہ ۱۲ جنوری تک یہ مسئلہ کیوں نہ پیش آیا سب جانتے ہیں کہ مسٹر کاردار نے یکم جنوری کو پی پی ایل کی جدوجہد میں بھوک ہڑتال میں شامل ہونے کا اعلان کیا تھا۔ کیا اس تاریخ سے لے کر ان کی بھوک ہڑتال میں شامل ہونے سے پہلے پارٹی کی طرف سے کوئی حکم MANDATE جاری کیا گیا تھا۔ اگر جاری ہوا تھا تو پھر پارٹی کے سرکردہ رہنماؤں نے ۱۶ جنوری کے پی پی ایل ملازمین کے جلوس شرکت کی۔ اپنی تقریروں میں صفدر میر کی بھوک ہڑتال کو ۱۳ کروڑ عوام کی بھوک ہڑتال اور جدوجہد کیوں قرار دیا۔ ۱۵ جنوری کو جن رہنماؤں نے اس تحریک کی حمایت کی۔ ان میں قصوری صاحب شیخ رشید صاحب اور حنیف رامے بھی شامل تھے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مسٹر کاردار ۷ جنوری سے بھوک ہڑتال کرنے والے ہیں۔ اگر ان کی بھوک ہڑتال پارٹی کے حکم کے منافی تھی تو انہوں نے پارٹی کے کارکنوں کو اس میں بڑھ چڑھ کر حصے لینے کی تلقین کیوں کی۔ اور ۱۲ جنوری تک یہ کیوں ثابت کرتے رہے کہ تحریک کی قیادت جائز طور پر پارٹی نے اختیار کر لی ہے اور یہ بات "پارٹی کے مزاج اور منشور کے عین مطابق ہے"

اگر حنیف رامے صاحب کو پریشانی اس سے لاحق ہوئی کہ ۱۱ جنوری کو انتظامیہ کی جانب سے طاقت کے استعمال کے بعد فوج کو پولیس کی امداد کے لئے طلب کر لیا گیا تو اس کی ذمہ داری کس کے سر ہے کیا یہ حقیقت نہیں کہ جدوجہد کے سارے عرصہ میں پی پی ایل کے ملازمین اور دوسرے

# حنیف رامے کا وِیر "مہم جوئی" اور "موقع پرستی" کا شکار ہوگیا؟

مظاہرین بالکل پرُامن تھے۔ ۱۱ تاریخ کو خود کاردار صاحب نے مداخلت کر کے ہزاروں مظاہرین کو پی پی ایل کے دفتر میں داخل ہونے سے روک دیا تھا اور قبضہ کی دھمکی کو ملتوی کر دیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے یہ انتظامیہ تھی جس نے پرُامن مظاہرین کو جو خاموشی سے پی پی ایل کے دفتر کے سامنے جمع تھے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے استعمال کے ذریعہ منتشر کیا۔ جس سے کئی لوگ زخمی ہوئے انہوں نے انتہائی بے دردی سے بھوک ہڑتالی کیمپ تک کے اندر اکنو گیس چھوڑی۔ اس کے بعد انہوں نے زبردستی کیمپ اٹھوا دیا۔ مسٹر کاردار اور ان کے ساتھیوں کو حراست میں لے لیا اور پھر انہیں فوج کی نگرانی میں گول باغ میں منتقل کر دیا۔ ہم تو امید کرتے تھے کہ حنیف رامے صاحب جو مدیر ہونے کے علاوہ پارٹی لیڈر بھی ہیں۔ کم از کم دو جملے ہی انتظامیہ کی مذمت میں لکھ دیتے۔ موجودہ انتظامیہ کب سے عوامی انتظامیہ ہوگئی کہ اس کی آئنی پاسداری ملحوظ خاطر ہے۔ رہ گئی فوج اور عوام کی ٹکر کا اندیشہ تو مدیر مساوات جو ہمہ وقت انقلاب اور انقلابی عمل کا دم بھرتے ہیں اتنا تو جانتے ہوں گے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ طبقاتی معاشرہ میں پوری اسٹیٹ مشینری جن میں نوکر شاہی فوج اور پولیس سبھی شامل ہیں۔ اقتدار پر قابض طبقوں کے مفادات کے تحفظ ہی کے لئے ہوتی ہے۔ اور جب عوام جدوجہد کرتے ہیں تو پوری اسٹیٹ مشینری حرکت میں آجاتی ہے اور اس چیز کا اندیشہ پیدا ہوجاتا ہے جس سے رامے صاحب خوفزدہ ہیں۔ رامے صاحب جانتے ہیں کہ جب مسٹر بھٹو نے نومبر ۱۹۶۸ء سے عوامی جدوجہد کی اگوائی کی تو وہ دونوں باتیں پیش آئیں جن کی بناء پر انہوں نے مسٹر کاردار اور پیپلز پارٹی کے دوسرے رہنماؤں اور کارکنوں کو موقعہ پرست گردانا ہے۔

یعنی مسٹر بھٹو کی ذات بھی چیکنگ اور کئی مرتبہ پولیس اور فوج اور عوام کا آمنا سامنا ہوا۔ کئی مرتبہ کرفیو بھی (اس مرتبہ تو کرفیو بھی نہیں لگایا گیا) لگا مغربی پاکستان میں بھی اور مشرقی پاکستان میں بھی۔ کئی شہر فوج کے حوالے کئے گئے لیکن ان باتوں سے عوامی جدوجہد آگے ہی بڑھی۔

اگر پی پی ایل ملازمین کے مطالبات اور پارٹی کے رہنماؤں کی بھوک ہڑتال کے متعلق مسٹر حنیف رامے کے مؤقف میں "انقلابی تبدیلی کی وجہ جو ۱۲ جنوری کے بعد پیدا ہوئی مسٹر بھٹو کی ۱۳ جنوری پریس کانفرنس ہے جس میں انہوں نے آئین سازی کو دوسری باتوں پر مقدم رکھنے کی اپیل کی تھی اور روانی میں ان پارٹی لیڈروں کو جنہوں نے بھوک ہڑتال میں شرکت کی تھی "گیلا باڈ اور سرلینیپلات" کے القاب سے نوازا تھا۔ تب بھی مسٹر حنیف رامے اور دوسرے مقامی لیڈروں کا فرض تھا کہ وہ چیرمین کو صحیح مشورہ دیتے اور بتاتے کہ اگر یہ ثابت بھی کر دیا کہ پارٹی کے رہنماؤں نے بھوک ہڑتال میں شریک ہو کر غلطی کی ہے۔ تو بھی یہ غلطی اجتماعی تھی۔ اس مسئلہ کا بعد میں پارٹی کے اندر جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ یہ کیسی انقلابی پارٹی ہے جو اپنے اندرونی تضادات کو پہلے ہی مرحلہ میں منظر عام پر لے آتی ہے جس میں خود تنقیدی کا فقدان ہے۔ جو اپنے رہنماؤں اور کارکنوں کی طرف سے عوامی جدوجہد میں شمولیت پر انہیں مبارکباد دیتی ہے ان کی پیٹھ ٹھونکتی ہے ان کے اقدام کو پارٹی کے مزاج اور منشور کے مطابق قرار دیتی ہے۔ اور پھر یک لخت سب کچھ بھول کر اپنے اخبار کے کالموں میں انہیں "موقعہ پرست" قرار دے دیتی ہے۔

**ترقی پسند صحافی پیپلز پارٹی**
**کا اُس وقت تک ساتھ**
**دیں گے جب تک وہ**
**حق، اِنصاف اور عوام**
**دوستی کے راستے پر**
**گامزن رہے گی**

کیا اچھا ہوتا کہ حنیف رامے صاحب ۱۶ جنوری کے اداریے میں کچھ خود تنقیدی سے بھی کام لے لیتے اور ان گروہی وجوہ کی بناء پر جن سے وہ اچھی طرح واقف ہیں محض کاردار اور ان کے دوسرے جماعتی رفقاء کو قربانی کا بکرا نہ بناتے۔

جہاں تک پی پی ایل ورکرز یونین اور اس ملک کے عوام دوست صحافیوں کا تعلق ہے انہیں اس حقیقت پر فخر اور مسرت ہے کہ اس ملک میں پہلی بار صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے ایسے رکن منتخب ہوئے ہیں جو عوامی مفاد کے لئے اپنی جان تک کی بازی لگانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جنہیں اسمبلی کی کرسیوں اور پرمٹ اور لائسنس سے زیادہ عوام کے مفادات عزیز ہیں۔ ہماری رائے ہے اگر کاردار، مختار رانا، احمد رضا اور حامد لیسین جیسے لوگ اپنے سیاسی رجحان میں ثابت قدم رہیں بلکہ اپنی پارٹی میں اور کاردار اور مختار رانا پیدا کر سکیں تو اس سے پارٹی اور ملک دونوں کا بھلا ہوگا۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ پی پی ایل ورکرز یونین کی مجلس عمل نے شروع ہی سے یہ کوشش کی کہ اس تضیہ کا پرُامن تصفیہ جلد سے جلد ہو جائے۔

یونین کے صدر مسٹر صفدر میر نے جو ایک نامور عوام دوست صحافی ہیں اپنی جدوجہد کے آغاز سے ایک ہفتہ پہلے انتظامیہ کو نوٹس دیا تھا کہ اس نے بڑے پیمانے پر ملازمین کی برطرفیوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اسے بند کرے۔ اور برطرف ملازمین کو فوراً بحال کرے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک کھلی چٹھی صدر یحییٰ، شیخ مجیب الرحمٰن اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو بھی لکھی تھی جس میں گذشتہ اپریل کی ملک گیر صحافیوں کی ہڑتال





# رجعت پسند عناصر فوج اور عوام میں ٹکراؤ کرانا چاہتے ہیں

کے بعد نیشنل پریس ٹرسٹ اور پی پی ایل کے حکام کی جانب سے بڑے پیمانے پر محب وطن صحافیوں اور دوسرے عملہ کی تطہیر اور پی پی ایل کے مالی اور انتظامی امور کی تحقیقات کی فوری ضرورت کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی۔ انہوں نے اپنے خط میں یہ بھی بتایا تھا کہ کس طرح ٹرسٹ اور پی پی ایل کی انتظامیہ نے اپریل کی تطہیر کے بعد برطرفیوں کا نیا دور شروع کیا ہے جس میں مزید ۴۲ افراد ملازمتوں سے برطرف کر دیئے گئے ہیں۔

بھوک ہڑتال کا فیصلہ بھی یونین نے اتفاق رائے سے کیا تھا۔ جدوجہد کی اس شکل سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن جدوجہد شروع ہونے کے بعد جدوجہد کرنے والے مظلوم عوام کی مدد کرنا ان سب کا فرض ہے جو عوام کے ساتھ مرنے اور جینے کی قسم کھاتے ہیں۔ ہمارے یہ مقام مسرت و اطمینان ہے پیپلز پارٹی کے سرکردہ رہنماؤں نے جن میں میاں محمود علی قصوری، شیخ رشید اور جناب حنیف رامے شامل تھے۔ اس جدوجہد کی مکمل حمایت کی اور موخر الذکر نے تو صفدر میر کی بھوک ہڑتال کو ۱۳ کروڑ عوام کی جدوجہد سے تعبیر کیا اور گلی گلی، محلے محلے مورچے لگانے کی تلقین کی۔

پی پی ایل ورکرز یونین کی مجلس عمل نے دوسرے ہی دن سے میاں محمود علی قصوری کی اپیل پر حکام سے مذاکرات شروع کر دیئے تھے اور ۱۰ جنوری کو اس نے حکام ہی کی پیش کردہ مندرجہ ذیل تجاویز منظور کر لی تھیں جن کی بنیاد پر مجلس عمل بھوک ہڑتال ختم کرنے پر رضامند تھی۔

۱۔ صفدر میر اور ان کے پانچ ساتھیوں کی فوری رہائی، تاکہ وہ رہا ہو کر بھوک ہڑتال ختم کرانے میں مدد دے سکیں۔

۲۔ ۱۸ ملازمین کی ملازمت پر فوری بحالی اور اس مقصد کے لئے احکام کا فوری اجراء

۳۔ یہ ضمانت کہ آئندہ بھوک ہڑتالیوں یا کسی اور ملازم کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی جائے گی۔

۴۔ یہ ضمانت کہ پی پی ایل میں ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی پوری آزادی ہوگی۔

۵۔ پی پی ایل میں ایڈمنسٹریٹر کا تقرر اور اس کے مالی اور انتظامی امور کی تحقیقات۔

(حکام نے وعدہ کیا تھا کہ آخری شرط کے لئے وہ مرکزی حکام کو سفارش کر دیں گے اور یونین کے اس مطالبہ کو بھی مرکزی حکومت کے سامنے پیش کر دیں گے کہ نیشنل پریس ٹرسٹ فوراً توڑ دیا جائے اور پی پی ایل کو ملازمین کی ملکیت میں دیدیا جائے)

اس سے یہ بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ یونین کا رویہ مسلسل مصالحانہ رہا ہے اور اس کی طرف سے کسی وقت بھی بحران کو طول دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔

**انقلابی پارٹی**

**کا خاصہ محض**

**بے لاگ تنقید ہی**

**نہیں بلکہ خود**

**تنقیدی بھی**

**ہوتا ہے**

مثلاً اس نے اپنے اس مطالبہ کو التوا میں ڈال کر منظور کر لیا تھا کہ شیخ آفتاب جنرل منیجر پی پی ایل کو برطرف کیا جائے۔ اور فوری طور پر ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا جائے۔ یونین نے حکام کی یہ بات مان لی تھی کہ اس سلسلہ میں مرکزی حکام کو سفارش پیش کر دی جائے۔ ان تمام باتوں سے پیپلز پارٹی کے بھوک ہڑتالی رہنماؤں کو بھی اعتماد میں لیا گیا تھا اور ان سے صلاح مشورہ لیا گیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ تمام مذاکرات میاں محمود علی قصوری، شیخ رشید اور مسٹر حنیف رامے ہی کے توسط سے انجام پائے تھے۔

اس کے بعد یہ بات بھی سب کے علم میں ہے کہ کس طرح ۱۱ جنوری کو جب یونین ہڑتال ختم کرنے والی تھی، پی پی ایل کی انتظامیہ اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین شیخ عبدالرحمٰن اپنے قول سے مکر گئے۔ اور ان سے متاثر ہو کر لاہور کے سول اور فوجی حکام نے بھی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ شیخ عبدالرحمٰن نے کہا کہ انہوں نے اٹھارہ ملازمین کو نہیں بلکہ صرف سات ملازمین کو بحال کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ جب اس بدعہدی کی جانب میاں محمود علی قصوری اور شیخ رشید نے توجہ مبذول کرائی تو انہوں نے کہا "ہم کیا کریں، جسٹس رحمٰن اور شیخ آفتاب نہیں مانتے۔" ظاہر ہے کہ اس کے بعد یونین کی مجلس عمل کے سامنے کوئی راستہ نہ تھا بجز اس کے کہ وہ بھوک ہڑتال جاری رکھنے کا اعلان کرے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱ جنوری کی شام کو جو واقعات پیش آئے ان کو ظہور میں لانے ہی کے لئے حکام اور پی پی ایل کی انتظامیہ نے بدعہدی کی تھی شام آٹھ بجے جب سینکڑوں مظاہرین پرامن طور پر پی پی ایل کے دفتر کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے، بغیر کسی اشتعال کے لاٹھی چارج کیا گیا۔ پھر فوج طلب کی گئی۔ پھر لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال کیا گیا۔ ساڑھے دس بجے رات کو جب ہجوم بڑی حد تک منتشر ہو گیا تھا اور صرف بھوک ہڑتالی اور ان کے ساتھی رہ گئے تھے۔ میاں محمود علی قصوری، شیخ رشید اور مسٹر حنیف رامے تشریف لائے۔ اول الذکر دو رہنماؤں نے اپنی تقریروں میں اعتراف کیا کہ حکومت نے بدعہدی کی ہے۔

اس کے بعد کون یہ کہہ سکتا ہے کہ پیپلز پارٹی کے وہ رہنما جو بھوک ہڑتال پر تھے یا پی پی ایل ورکرز یونین "فوج اور عوام کی ٹکر" کرانا چاہتے تھے۔ یہ ٹکر تو خود انتظامیہ کے رجعت پسند عناصر کرانا چاہتے تھے۔ جن کی مسٹر حنیف رامے نے بدقسمتی سے اپنے اداریے میں مذمت کرنا پسند نہ کیا۔

تاہم پی پی ایل کے ملازمین اور صحافی اور ملک کے تمام محب وطن عناصر، پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر بھٹو کے اس اقدام کے شکر گزار ہیں کہ ۳ ارجنوری کو انہوں نے ذاتی طور پر مداخلت کی۔ وہ خود گول باغ کیمپ تشریف لے گئے جہاں کاردار، رانا، احمد رضا، میاں حامد یٰسین، پاکستان ٹائمز کے سینئر سب ایڈیٹر ابوالبرکات، پاکستان ٹائمز کے رپورٹر علی اصغر اور پیپلز پارٹی کے چار اور کارکن فوج کی حراست میں اپنی بھوک ہڑتال جاری رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے انہیں یقین دلایا کہ یونین کے جو مطالبات حکام نے ۱۰ ارجنوری کو تسلیم کئے تھے ان پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ اور وہ اس کی پوری کوشش کریں گے کہ پی پی ایل میں ایک ناظم کا تقرر عمل میں آئے اور اس کے مالی انتظامی امور کی تحقیقات کی جائے۔ اس یقین دہانی پر پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے اپنی بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ سہ پہر تک مسٹر صفدر میر اور ان کے ساتھی بھی رہا کر دیئے گئے اور انہوں نے بھی بھوک ہڑتال ختم کر دی۔

اب قارئین خود فیصلہ کریں کہ اس سارے مسئلے میں "موقع پرستی"۔ "مہم بازی" اور "اپنی ذات کو چمکانے" کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ کیا صفدر میر اور کاردار "موقع پرستی اور مہم بازی" کا شکار ہوئے؟ اور انہوں نے نیشنل پریس ٹرسٹ کے خلاف اور ظلم طاقتوں اور دیگر ملازمین کے مطالبات کے لئے جو پرامن جدوجہد کی وہ محض "اپنی ذات کو چمکانے" کے لئے تھی یہ باتیں نہیں رکھتے تھی؟ اور یہ باتیں اور نہیں مسٹر حنیف رامے لکھیں جو ۱۲ ارجنوری تک پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو اس جدوجہد کی حمایت میں گلی گلی مورچے لگانے کی ترغیب دیتے تھے۔

کاش کہ مسٹر حنیف رامے اگر واقعی اپنے ۱۶ ارجنوری کے اداریے کے تمام الفاظوں پر خلوص سے یقین رکھتے تھے تو کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اپنی ذات پر بھی اور پارٹی کے ان دو ایک رہنماؤں پر بھی جو جدوجہد کے دوران شکست خوردگی کا شکار ہو گئے تھے خود تنقید سے کام لیتے۔ وہ شخص جو پیپلز پارٹی کا ذکر کرتے ہوئے "انقلاب" اور "ردِ انقلاب" جیسی انقلابی سائنس کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ انقلابی پارٹی کا خاصہ محض بے لاگ تنقید ہی نہیں بلکہ خود تنقیدی بھی ہوتا ہے۔ ہم اس دن کے منتظر رہیں گے جب مدیر "مساوات" دوسروں کے ساتھ اپنی ذات پر بھی تنقید کی جرأت اور حوصلہ کا مظاہرہ کر سکیں گے۔ جہاں تک پی پی ایل ورکرز یونین پی ایف یو جے اور ملک کے تمام ترقی پسند صحافیوں کا تعلق ہے، ہم ایک بار پھر پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کو یقین دلاتے ہیں کہ جس طرح انہوں نے ہماری جدوجہد میں ساتھ دیا ہے، ہم بھی ان کا اور ان کی جماعت کا اس وقت تک ساتھ دیں گے جب تک وہ حق، انصاف اور عوام دوستی کے رستے پر گامزن رہیں گے۔

---

# کسانوں کے غموں کی داستاں

صفدر سلیم سیال

وہ رُتوں کے سلسلے رنگیں زمانے دیکھ لے
اپنے دل میں جھانک کر موسم سہانے دیکھ لے
مجھ کو تو آواز دے کر رات کے پچھلے پہر
کنجِ دل میں گونجتے سارے زمانے دیکھ لے

کس لئے چھپتا ہے سیدھا دل کے دروازے سے آ
اس مکاں میں دفن ہیں جتنے خزانے دیکھ لے
رات کی تاریکیوں میں وار کرتے ہیں تجھے
تو بدل کر بھیس دشمن کے ٹھکانے دیکھ لے

تو چلاتا تیشے مگر پیڑوں کی شاخوں پہ ذرا
چہچہاتے پنچھیوں کے آشیانے دیکھ لے
سامراجی قوتوں پر ناز تھا جن کو بہت
ہم نے وہ بھی چت گرائے چاروں شانے دیکھ لے

کیا سناؤں اِن کسانوں کے غموں کی داستاں!
سوکھتی فصلوں پہ بڑھتے آبیانے دیکھ لے
کر رہا ہوں منتقل شعروں میں دل کی واردات
تو مرے زخموں کو شاید اس بہانے دیکھ لے

کیا خبر ان کو بھی کفنا دیں کبھی گرد و غبار!
آج تو جی بھر کے وہ رستے پرانے دیکھ لے
صبح دم محشر بپا کر دے گا سورج شہر میں
رات بھر کی بات ہے سپنے سہانے دیکھ لے

آنے والی ہے نگارِ صبح کی بارات بھی!
وہ اُفق پر نصب ہوتے شامیانے دیکھ لے
آسمانوں کے دریچے کھل چکے صفدر سلیم
تو خلا میں آج اُن دیکھے زمانے دیکھ لے



ایک سیاسی جماعت کا بنایا ہُوا آئین قابلِ قبول نہ ہوگا

# صدر یحییٰ نے مجیب اور بھٹو سے ملاقاتیں کیوں کی؟

## مجیب اور بھٹو کے مابین افہام و تفہیم ضروری ہے

وقائع نویس

صدر یحییٰ کی عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن اور پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقاتوں کی تفصیلات جاننے کا شوق ملک بھر کے شہریوں میں بدرجۂ اتم پیدا ہوا۔ نجی محفلوں، ہوٹلوں، گلی کوچوں اور گھروں میں اس موضوع پر ہر اک نے اپنی اپنی معلومات کی روشنی میں بات چیت کی۔ اس دوران ایک سوال یہ بھی سامنے آیا کہ آخر صدر یحییٰ اس قدر کیوں دلچسپی لے رہے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں جتنے منہ اتنی باتیں ہوئیں یہاں تک سنا گیا کہ آئندہ کے صدر کو پہلے ہی سے تیاریاں کرنا پڑ رہی ہیں۔ حالانکہ انہیں یہ علم نہ تھا کہ آئینی ڈھانچہ کے قانون کے مطابق صدر یحییٰ کو اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے لئے اکثریتی جماعتوں کے رہنماؤں کو ایک ایسے آئین کے لئے تیار کرنا تھا جو آئینی ڈھانچہ کی رو سے پاکستان بھر کا نمائندہ ہو۔ قانون کی روشنی میں کوئی ایسا آئین قابلِ قبول نہ ہوگا جسے ایک سیاسی جماعت نے تیار کیا ہو۔ اس لئے کہ آئینی ڈھانچہ کے قانون کے پانچ بنیادی نکات میں سے ایک یہ بھی ہے "اسمبلی ایک ایسا آئین بنائے جسے پاکستان بھر کے عوام کی تائید حاصل ہو۔"

نیز یہ کہ صدر یحییٰ نے ۲۸ر مارچ ۱۹۷۰ء کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "آئین کا چوتھا اصول یہ ہے کہ وفاقی حکومت کے پاس قانون سازی انتظامی اور مالی امور کے اختیارات اس طرح ہوں گے کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری مل سکے۔ وفاقی حکومت کو اس قدر اختیارات ملیں کہ وہ داخلہ اور خارجہ امور سے نمٹنے کی اہل ہو اور ملک کی سالمیت اور آزادی کی نگہبانی کر سکے۔"

انہوں نے مزید کہا "آئین کا پانچواں اصول یہ ہے کہ آئین کے تحت ملک بھر کے تمام ریجنوں کے عوام کو ملکی معاملات میں حصہ لینے کے بھرپور مواقع میسر ہوں تاکہ وہ باہمی طور پر باعزت فریقین کی حیثیت سے رہیں اور ملک کو بابائے ملت کی خواہشات کے مطابق مضبوط بنائیں۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آئین کی تشکیل کے لئے ایک صوبے نہیں بلکہ ملک کے دونوں حصوں کے عوام کی شرکت ضروری ہے۔ بعض اصحاب کی یہ رائے رہی ہے کہ معمولی اکثریت کے ساتھ بھی آئین بنایا جا سکتا ہے۔ یہ درست نہیں کیونکہ صدر یحییٰ نے ۲۸ر نومبر ۱۹۶۹ء اور ۲۸ر مارچ ۱۹۷۰ء کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے واضح کر دیا تھا کہ:-

"قومی اسمبلی آئین جیسی اہم دستاویز کے بنیادی امور پر فیصلہ کرے گی۔ آئین وہ مقدس دستاویز ہے جس کی رو سے باہمی طور پر رہنے پر اظہارِ رضامندی کیا جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اسمبلی میں تمام ریجنوں کے نمائندے ہوں۔"

انہوں نے ۲۸ر مارچ ۱۹۷۰ء کے نشریہ میں کہا "میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ آئین کی تشکیل معمولی کام نہیں۔ اس پر ایک بار پھر زور دیتا ہوں کہ آئین مل کر رہنے کا معاہدہ ہوگا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس پر تمام ریجن دلی طور پر مطمئن ہوں۔ اور ایوان میں رائے دینے کا حق استعمال کریں۔ ایسا نہ ہوا تو آئین جیسی دستاویز صحیح معنوں میں تمام صوبوں کے عوام کی نمائندہ نہ ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ معقول انداز میں انتظام ہو جائے گا۔"

ملک بھر میں عام انتخابات آئینی ڈھانچے کے قانون کے تحت ہوئے ہیں۔ عام انتخابات کے بعد اس قانون کے اطلاق کے بارے میں شک و شبہات یا اس کے وجود سے انکار کی حالت بالکل ایسی ہوگی کہ عام انتخابات کے نتائج کو تسلیم نہ کیا جائے۔ جب انتخابات کے نتائج کی روشنی میں قومی اسمبلی کی بات ہوگی تو یقیناً آئین سازی کے مرحلہ کے وقت بھی اسی قانون کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور اس کے مطابق کوئی آئین اس وقت تک ملک کے عوام کے لئے قابلِ قبول نہ ہوگا جب تک اس ملک کے تمام ریجنوں کے نمائندوں کا اعتماد حاصل نہ ہو۔

ان حالات میں صدر یحییٰ کے لئے ضروری تھا کہ وہ ملک کے دونوں حصوں کی اکثریتی جماعتوں کے سربراہوں کے سامنے نیک و بد رکھ دیں اور آئین سازی کے مرحلہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کے سلسلے میں اپنا تعاون پیش کریں۔

مبصرین کا استدلال یہ ہے کہ آئینی ڈھانچے پر عملدرآمد کرانے کے لئے مجیب اور بھٹو کے مابین افہام و تفہیم ضروری ہے۔ بصورت دیگر قوم کو آئین نہیں مل سکے گا۔

# صدر کینیڈی کا و

صدر کینیڈی نے تسلیم کر لیا ک

پر ہوا تھا۔ انہوں نے ناک

لیکن چند دنوں بعد ایک س

ناکامی کا ذم



**فیدل کاسترو کی حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ**

صدر آئزن ہاور کے دورِ حکومت کے آخری دنوں میں تیار کیا گیا تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کیوبا کے باغیوں کو، جو ملک بدر کئے جا چکے تھے، باقاعدہ امداد مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ منصوبے کی جزئیات طے کرنے اور ضروری اقدامات ترتیب دینے کی ذمہ داری سی آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر برائے منصوبہ بندی رچرڈ۔ ایم۔ بسل کو سونپی گئی۔ بسل نے جو منصوبہ بنایا اس میں کہا گیا تھا، کہ جلاوطن کیوبن باشندوں کو گوئٹے مالا کے امریکی فوجی اڈے میں جنگی تربیت دی جائے اور ان کو کیوبا پر حملہ کرنے پر رضامند کیا جائے۔ اس طویل منصوبے کی آخری شق یہ تھی کہ کیوبا پر سی آئی اے کے مجوزہ حملے کی تمام تر تفصیلات پر مسلح افواج کے سربراہ نظرثانی کریں اور آخری منظوری صدر مملکت بذاتِ خود دیں۔

صدر آئزن ہاور کی اس یقین دہانی پر کہ یہ منصوبہ منظور کر لیا جائے گا۔ کیوبا کے جلاوطن لوگوں پر مشتمل ایک فوج تیار کر لی گئی اور ان کو امریکہ کے مقامات لوزیانہ، فلوریڈا اور وسطی امریکہ میں جنگ کی تربیت دی جانے لگی۔ اس کے علاوہ ایک فضائی فوج بھی تیار کی گئی جس کی تربیت کے لئے سی آئی اے نے گوئٹے مالا میں امریکہ کے خفیہ فوجی اڈے کا انتخاب کیا۔ اس کام کے تمام تر اخراجات سی آئی اے کے بجٹ سے مہیا کئے گئے۔

عین اس زمانے میں جان ایف کینیڈی صدر کی حیثیت سے وائٹ ہاؤس میں داخل ہوئے۔ عہدۂ صدارت کے حلف اٹھانے کی رسم سے قبل سبکدوش ہونے والے صدر (آئزن ہاور) نے اپنے جانشین (کینیڈی) کو حسبِ دستور بین الاقوامی امور کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا اور انہوں نے اس امر پر خاص طور سے زور دیا کہ سوویت یونین سے ملنے والی فوجی امداد سے کیوبا امریکہ کے لئے ایک جوالا مکھی بنتا جا رہا ہے۔ انہوں نے کیوبا کے متعلق سی آئی اے کے منصوبے سے بھی صدر کینیڈی کو آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس سلسلے میں مزید تاخیر کا یہ لازمی نتیجہ ہو گا کہ امریکہ کو بذاتِ خود اس جنگ میں کودنا پڑے گا جس سے بہرحال عالمی میدان میں اس کی شہرت کو زک پہنچے گا۔

پہلی مرتبہ جب سی آئی اے کے سربراہ نے یہ منصوبہ صدر کینیڈی کی خدمت میں پیش کیا تو اس میں کیوبا پر حملہ کرنے کا مقام کیوبا کا شہر ٹرینی ڈاڈ تھا۔ صوبہ لاس دیلاس کے اس شہر کی آبادی تیس ہزار کے لگ بھگ تھی اور یہ شہر کیوبا کے جنوبی ساحل پر واقع تھا۔ اس کو منتخب کرنے کی اولین وجہ اس کی دارالحکومت ہوانا سے دور افتادگی تھی۔ کیوبا کی افواج کا زیادہ تر حصہ ہوانا ہی میں موجود تھا اور پھر سی آئی اے کی رپورٹیں ظاہر کرتی تھیں کہ اس شہر کی غالب آبادی فیدل کاسترو کی شدید ترین مخالف ہے اور جنگ کی صورت میں حملہ آوروں کی امداد کر سکتی ہے اس کے علاوہ جنگی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ علاقہ بہت موزوں تھا کیونکہ پہاڑوں کی ترائی میں واقع ہونے کی وجہ سے یہ بہترین دفاعی لائن بن سکتا تھا۔

لیکن اس مقام پر سے حملے کی ابتدا کرنے میں چند قباحتیں بھی موجود تھیں۔ اس کے ساحل پر دور دور تک سمندر میں خفیہ چٹانیں موجود تھیں جو بحری جہازوں کے لئے تباہی کا سامان بن سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کا ہوائی اڈہ بھی اتنا وسیع و عریض نہیں تھا کہ اس پر بی ۲۶ قسم کے طیارے اتر سکیں اور پرواز کر سکیں۔ چنانچہ



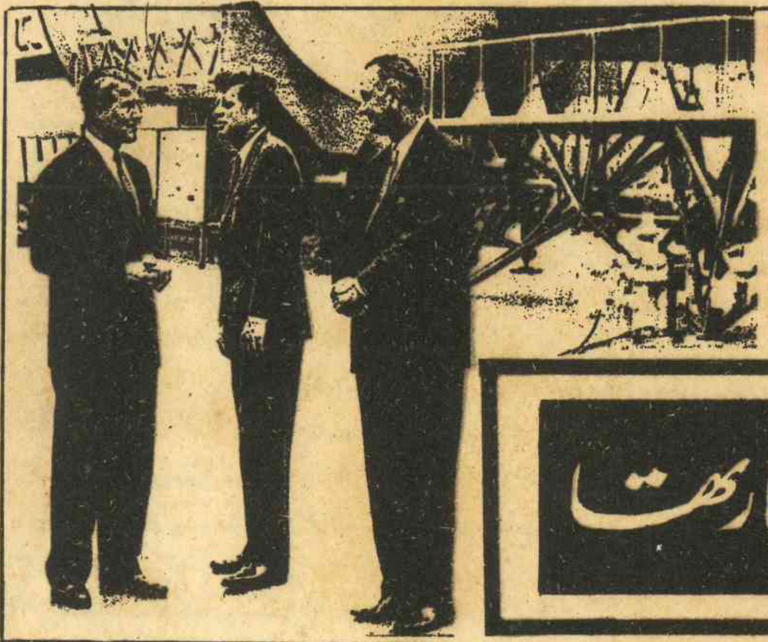
... کیوبا پر حملہ امریکہ کی ایما

... کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔

... کاری ترجمان نے سی۔ آئی۔ اے کو

... دار ٹھہرایا

# ... تل سی آئی اے کا آلۂ کار تھا



صدر کینیڈی اور لنڈن بی جانسن ایک اہم عہدیدار سے صلاح مشورہ کر رہے ہیں

... د محمد سلیمان

مسلح افواج کے سربراہوں نے ان جنگی نوعیت کے حقائق کو مدنظر رکھ کر اس شہر پر سے حملے کا آغاز کرنے کے خلاف فیصلہ دیا۔

دوسری طرف صدر کینیڈی کے خارجہ پالیسی کے مشیر اور دفتر خارجہ کا موقف یہ تھا کہ اس حملے میں امریکہ کی شمولیت کو ہر قیمت پر مخفی رکھنا ہے ورنہ عالمی رائے عامہ کے سامنے امریکہ کی بڑی سبکی ہو گی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر ٹرینی ڈاڈ جیسے بڑے شہر کے ساحل پر فوجوں کو اتارا گیا تو لوگوں کو حقیقت سمجھنے اور پرکھنے میں کوئی وقت پیش نہ آئے گی اور ان کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہے گا کہ اس کی پشت پر امریکہ کا ہاتھ کار فرما ہے۔

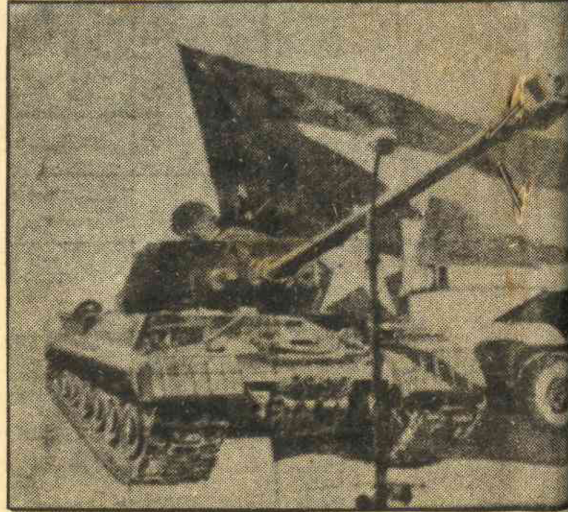
چنانچہ فوجی ماہرین اور خارجہ پالیسی کے مشورے پر صدر کینیڈی نے سی آئی اے کو حکم دیا کہ وہ حملے کے لئے کوئی اور مقام منتخب کرے

۱۰ اپریل کو وائٹ ہاؤس میں ایک اعلیٰ سطحی اجلاس منعقد ہوا جس میں ٹرینی ڈاڈ کے بجائے خلیج پگز پر حملے کی آخری منظوری دی گئی۔ یہ مقام بھی انٹیلیجنس کی رپورٹ کے مطابق کافی حد تک مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے قرب و جوار میں کیوبا کی فوج موجود نہیں تھی اور اس کے علاوہ وہاں کے فضائی مستقر۔ پلایا گیرون۔ پر ہر قسم کے طیارے با آسانی اتر اور چڑھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ساحل سے لے کر اندرون ملک تک کا علاقہ ایک دلدل تھا اور اس علاقے کا ملک کے دیگر حصوں سے محض چار سڑکوں کے ذریعے رابطہ قائم تھا اور ان پر قبضہ کر کے اس علاقے کو ملک کے دیگر حصوں سے کاٹ کر ذرائع آمد و رفت اور رسد پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ فوجی ماہرین کا خیال تھا کہ اس علاقے میں طویل چھاپہ مار جنگیں ممکن نہیں اور پھر یہاں پر دفاع کا کوئی بندوبست نہیں

تاہم خارجہ پالیسی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان نقائص کے باوجود حملے کے لئے خلیج پگز کا انتخاب کر لیا گیا۔

اس منصوبے کو "اپریشن پلیٹو" کا کوڈ دیا گیا حملے کی اصل قوت فضائی حملوں کی کامیابی تھی۔ طے یہ کیا گیا تھا کہ فیدل کاسترو کی مختصر سی فضائیہ کو نکاراگوا کے ہوائی اڈے پیورتو کیبزاس پر اچانک حملہ کر کے چشم زدن میں نیست و نابود کر دیا جائے گا (اور سی آئی اے کے اسی پروگرام پر عمل کر کے اسرائیل نے عرب فضائیہ تباہ کر دی) اصل حملے سے قبل دو ہوائی حملوں کا منصوبہ تھا اور بری فوج کی کارروائی کا دور ہوائی حملوں کے بعد شروع ہونا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ کیا گیا تھا کہ نکاراگوا کے ہوائی اڈے پر فوری طور پر قبضہ کر لیا جائے تاکہ آزاد کیوبن فضائیہ کو وہاں منتقل کر دیا جائے اور کیوبا کی تمام تر فضا پر مکمل قابو کر لیا جائے۔

سی آئی اے کو یقین واثق تھا کہ فضائیہ کی تباہی کے ساتھ ہی کاسترو کی حکومت گھٹنے ٹیک دے گی۔ اور پھر ایک ایسی حکومت با آسانی قائم کی جا سکے گی کہ جو دوسرے ممالک سے امداد اور نئی حکومت کے تسلیم کئے جانے کی درخواست کرے گی جس کو امریکہ کے خیمہ بردار ممالک فوراً تسلیم کر لیں گے۔



# کیوبا کے عوام دشمن کے خلاف اپنی فوج کے شانہ بشانہ لڑے

جب یہ منصوبہ ۴ر اپریل کو آخری منظوری کے لئے صدر کینیڈی کی خدمت میں پیش کیا گیا تو انہوں نے مشورے کے لئے وزیر خارجہ ڈین رسک۔ مسلح افواج کی ہائی کمان کے سربراہ جنرل لیمنٹزر۔ بحریہ کے کمانڈر انچیف آرلیگ برک۔ وزیر دفاع میکنامارا سی۔ آئی اے کے ڈائریکٹر ایلین ڈلس۔ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کیبل صدارتی مشیران میک جارج بنڈی، آرتھر شیلنگر اور ایوان بالا کی امور خارجہ کی کمیٹی چیرمین ولیم فلبرائیٹ کی ایک میٹنگ طلب کی۔ اس میٹنگ میں ولیم فلبرائیٹ نے اس مہم کے خلاف موزوں دلائل کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ اس نے صدر کینیڈی کو ایک یادداشت بھی پیش کی جس میں اس مہم کی شدید مخالفت کی گئی تھی لیکن اس کے اعتراضات رد کر دیئے گئے اور صدر کینیڈی نے اجازت نامے پر دستخط کر دیئے۔ حملے کے لئے ۷ر اپریل کی تاریخ مقرر کی گئی۔ اس فیصلے سے آزاد کیوبن فوج کو فوری طور پر مطلع کر دیا گیا اور حملے کی تیاریوں کو آخری شکل دی جانے لگی۔

لیکن اسی دوران میں کینیڈی حکومت میں اس امر پر شدید اختلاف رائے پیدا ہو گیا کہ امریکہ کو کیوبن جلاوطنوں کی کس قدر اور کس حد تک امداد کرنی چاہئے وزیر خارجہ ڈین رسک اور صدارتی مشیر آرتھر شلنگر اور میک جارج بنڈی وغیرہ جو اس سے قبل اس حملے کے پُر جوش حامی تھے اب اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے تھے ان کا مؤقف تھا کہ اس حملے میں امریکہ کو اپنی موجودگی کو خفیہ رکھنا ممکن نہیں ہے۔ جس سے بین الاقوامی میدان میں امریکہ کی سُبکی ہو گی۔ لیکن سی آئی اے اب بھی اس منصوبے کے حق میں تھی۔

سی آئی اے اور خارجہ پالیسی کے ماہرین میں رسہ کشی دیکھ کر نوجوان صدر کے پائے استقلال میں لرزش آگئی اور انہوں نے ان کے بین بین یہ فیصلہ کیا کہ کیوبا پر پہلے ہوائی حملے میں ۱۶ کی بجائے صرف ۸ طیارے استعمال کئے جائیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح دنیا کو یہ جھانسا دیا جا سکے گا کہ اس حملے میں امریکہ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

یہاں تک تو سی آئی اے نے برداشت کر لیا لیکن ۷ر اپریل کو صدر نے دوسرے ہوائی حملے کا پروگرام سرے سے ہی غائب کر دیا۔ جس وقت اس فیصلے کی خبر سی آئی اے کے ناخداؤں کو ملی تو وہ سر پیٹ کر رہ گئے۔ اور تنگ آکر انہوں نے فیصلہ کیا کہ فضائی حملے کا پروگرام بالکل ہی ختم کر دیا جائے لیکن اعلیٰ سطح پر پروگرام اس سے برعکس تھا اور وہ یہ تھا کہ پہلا حملہ ضرور ہو گا۔

چنانچہ اس فیصلے کے مطابق ۱۵ر اپریل کی صبح کو ۸ طیارے اپنے مستقر سے اڑے اور اندھا دھند کیوبا پر بمباری شروع کر دی۔ ان کا نشانہ خاص طور پر ہوائی اڈے اور بجلی گھر تھے۔

یہ طیارے بمباری کر کے واپس آئے۔ ان میں ایک طیارہ جس کے ہواباز کا نام ماریو زنگا تھا پروگرام کے مطابق امریکہ کے مقام میامی میں اترا۔ اس کے طیارے پر کیوبا کے طیاروں کا رنگ اور نشان پہلے ہی لگا ہوا تھا۔ اس نے رٹا رٹایا بیان دیا کہ وہ کیوبا کی ہوائی فوج کا ملازم ہے اور کیوبا کی فضائیہ نے کاسترو کی سوشلسٹ حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا ہے۔ اس طیارے اور ہواباز کی تصاویر امریکی

**اقوامِ متحدہ میں**
**امریکی مندوب نے**
**امریکی فضائیہ کے**
**طیارے کو کیوبا کا طیارہ**
**ثابت کرنے کی**
**ناکام کوشش کی**

خبر رساں ایجنسی نے دنیا بھر میں فی الفور تقسیم کر دیں لیکن ہواباز کا نام اس لئے نہیں لکھا کہ "اس کے خاندان پر کیوبا کی حکومت ظلم و ستم نہ ڈھائے"۔

اس حملے میں آزاد کیوبن فضائیہ کے تین طیارے تباہ ہو چکے تھے لیکن فوجی کمان نے اس حملے کو کامیاب قرار دیا۔ ان کے خیال میں کاسترو کی نصف فضائیہ کا خاتمہ کیا جا چکا تھا۔

دوسری طرف سیاسی جنگ کی ابتدا بھی ہو گئی اقوام متحدہ میں اس مسئلے کو پیش کیا گیا اور سیاسی کمیٹی کا ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔ شام تین بجے یہ اجلاس شروع ہوا۔ کیوبا کے وزیر خارجہ راول روا نے امریکہ پر الزام عائد کیا کہ یہ حملہ اس کی پشت پناہی کا نتیجہ ہے اور اسی نے اس حملے کے لئے تمام تر تیاریاں کی تھیں۔

لیکن امریکی نمائندے ایڈلائی اسٹیونسن نے اپنے ملک کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ کے کسی شخص یا طیارے نے حصہ نہیں لیا۔

پھر اس نے اخبار میں شائع شدہ ماریو زنگا کے طیارے کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا کہ اس پر کیوبا کی فضائی فوج کا نشان واضح طور پر نظر آرہا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کاسترو کی فضائیہ نے اس کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔

لیکن راول روا نے امریکی مندوب کی کذب بیانی کی دھجیاں اڑا دیں۔ اس نے تصویر ہی سے ثابت کر دیا کہ جس بی ۲۶ طیارے کو کیوبا کی فضائیہ کا باغی طیارہ بتایا جا رہا ہے وہ بناوٹ میں کیوبا کے طیاروں سے یکسر مختلف ہے اس نے بتایا کہ کیوبا کے طیاروں کے دو پنکھے ہوتے ہیں جبکہ اس طیارے کے چار پنکھے ہیں، جو ساختہ امریکہ طیاروں میں ہوتے ہیں۔ اس نے مطالبہ کیا کہ ہواباز کا نام بتایا جائے کیونکہ اگر ہم اس کے خاندان کو پکڑنا چاہتے ہیں تو تصویر دیکھ کر بھی ایسا کر سکتے ہیں۔

اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے سعودی

# سی آئی اے نے امریکی حکومت کو غلط معلومات مہیا کی تھیں

عرب کے وزیر خارجہ احمد شکیری نے کہا: "میں امریکی نمائندے سے دریافت کرتا ہوں کہ اگر یہ حملہ امریکہ نے نہیں کیا تو یہ حملہ آور کہاں سے آ گئے؟"

دوسری طرف اس حملے پر دنیا بھر میں شور مچ گیا تھا۔ فیدل کاسترو نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا "امریکی صدر دوسروں پر پتھر مار کر خود کو بے گناہ کہتے ہیں۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ اگر ان میں شرم کی ذرہ بھر بھی رمق باقی ہے تو وہ ان طیاروں اور ہوابازوں کو اقوام متحدہ کے سامنے پیش کر دیں ان کی سچائی کا پول کھل جائے..."

پاکستان میں کیوبا کے سفیر جناب انٹا نیو راڈرگز نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کیوبا ترنوالہ نہیں ہے بلکہ وہ سامراج کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگا۔"

دنیا بھر کے اخبارات نے بھی امریکہ کو مطعون کیا کہ اس نے دنیا کو جنگ کے مہیب شعلوں میں دھکیل دیا ہے۔ روس کے مشہور اخبار پراودا میں مبصر کے نام سے ایک مضمون شائع ہوا جس میں امریکی حملے کی شدید مذمت کی گئی تھی۔ اسی طرح چین کے اخبار پیپلز ڈیلی نے اس جنگ کی خبر آٹھ کالمی سرخی کے تحت دیتے ہوئے لکھا کہ امریکی سامراج کو شکست فاش اور کیوبا کو فتح ہوگی۔ چین کے وزیراعظم چو این لائی نے فیدل کاسترو کو حملہ پسپا کرنے پر ایک مبارکباد کا پیغام بھی بھیجا جس میں کہا گیا کہ چین ہر آزمائش میں کیوبا ساتھ رہے گا۔

سوویت یونین کے وزیراعظم خروشچیف نے امریکی صدر کینیڈی کو ایک پیغام بھیجا جس میں انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ امریکہ فی الفور اس حملے کو ختم کر دے وگرنہ سوویت یونین کیوبا کی مدد کے لئے میدان عمل میں کود پڑے گا۔

اس کے علاوہ دنیا بھر میں امریکہ کے خلاف مظاہرے کئے گئے۔ اور امریکی سفارت خانوں کو توڑ پھوڑ دیا گیا۔ صدر کینیڈی نے اگلے ہی روز خروشچیف کے مراسلے کا جواب دے دیا جس میں کہا گیا تھا کہ "ہم نے کیوبا پر حملہ نہیں کیا ہے اور یہ بغاوت اس کا اندرونی معاملہ ہے۔ لیکن اگر کسی بیرونی طاقت نے اس مرحلے پر دخل اندازی کی تو ہم انٹر امریکی سسٹم کے تحت اس کے خلاف کارروائی کریں گے۔"

عالمی رائے عامہ کا دباؤ دیکھ کر صدر کینیڈی نے آئندہ فضائی حملوں کا پروگرام قلمزد کر دیا۔ لیکن اس فیصلے نے اس منصوبے کی قسمت پر ناکامی کی مہر ثبت کر دی۔ اگرچہ سی آئی اے کے دباؤ کے تحت فوجی ماہرین نے صدر کو یہ فیصلہ واپس لینے پر بہت اکسایا لیکن ان کی یہ مساعی بار آور ثابت نہ ہوئی اور صدر کینیڈی اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے۔

یہ نازک وقت تھا جب جلاوطن فوج کیوبا پر حملہ

> **حملہ آور بار بار وائرلیس پر**
> **فضائی تحفظ کا مطالبہ**
> **کر رہے تھے، لیکن**
> **دوسری طرف موت کا سا**
> **پُر ہول سناٹا طاری تھا**

کرنے کے لئے بحری جہازوں پر خلیج پگز کی جانب عازم سفر تھی۔ ان کو یقین تھا کہ ان کے کیوبا کے ساحل تک پہنچنے سے پہلے ہی کیوبا کی فضائیہ کا تیا پانچہ ہو چکا ہو گا۔ اور وہ با اطمینان ملک پر قبضہ کر لیں گے۔

لیکن ان کا یہ خیال درست ثابت نہ ہوا۔

جب سمندری غوطہ خور خلیج پگز میں چٹانوں سے بچاتے ہوئے جہازوں کی ساحل کی طرف راہنمائی کر رہے تھے اور چند ایک کشتیاں ساحل پر اتر بھی چکی تھیں کہ ان پر قیامت ٹوٹ پڑی کاسترو کی فضائیہ فرشتۂ اجل بن کر ان پر جھپٹی اور اس نے آن کی آن میں ایک مال بردار جہاز کو اپنا نشانہ بنا لیا۔ یہی حشر ایک دوسرے جہاز کا بھی ہوا۔ ان کے عملے کو تیر کر سمندر عبور کرنا پڑا۔ اپنی جانیں بچانے کے لئے وہ اپنا اسلحہ بھی ساتھ نہ لا سکے اور بالکل نہتے ہو کر کیوبا کے ساحل پر اترے۔

پھر کاسترو کی بری فوج نے ان پر حملہ بول دیا۔

حملہ آوروں کو کمک ملنے کی بھی کوئی امید نہ تھی وہ بار بار وائرلیس پر فضائی تحفظ کا مطالبہ کر رہے تھے لیکن دوسری طرف موت کا سا پُر ہول سناٹا طاری تھا جب یہ خبر واشنگٹن پہنچی تو سی آئی اے اور فوجی ماہرین کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ چنانچہ صدر کینیڈی کو صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔ وہ بہت گھبرائے اور انہوں نے فوراً اجازت دے دی کہ ہوانا کے ہوائی اڈے کو فوراً تباہ کرنے کا بندوبست کیا جائے۔

محاذ جنگ سے اور بھی مایوس کن خبریں آنا شروع ہو چکی تھیں۔ چنانچہ فوری طور پر صدر کینیڈی کی اجازت سے فیصلہ کیا گیا کہ امریکی بحریہ کے دو طیارے کیوبا پر پرواز کریں گے اور اگر کیوبا کی فوج نے مداخلت کی تو وہ جنگ میں حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ یہ طیارے آزاد کیوبن فضائیہ کے ساتھ پرواز کر کے ان کا تحفظ کریں گے۔

لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ آزاد کیوبن فضائیہ ہوابازوں کی قلت کا شکار ہو گئی۔ کیونکہ ان کے زیادہ تر ہواباز مارے گئے تھے اور زخمی ہو گئے تھے۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ صرف ایک سی ۴۶ طیارہ پرواز کرے گا اور دو امریکی لڑاکا طیارے اس کی حفاظت کے لئے ساتھ جائیں گے۔ اس منصوبے کا واحد مقصد یہ تھا کہ یہ طیارہ کسی نہ کسی طرح پلایا گیروں کے ہوائی اڈے پر اتر کر آزاد کیوبن فضائیہ کے گرفتار ہواباز میٹیاس فریاس کو چھڑا لائے جو زخمی حالت میں کیوبا کی افواج کے ہاتھ لگا تھا۔ سی آئی اے کا خیال تھا کہ شاید اسکی

باقی صفحہ ۴۲ پر



# "شیش محلوں کے مکینوں کو خبر دیتا ہوں"

انور علیمی

شیش محلوں کے مکینوں کو خبر دیتا ہوں
جاگ اُٹھے ہیں، مرے دیس کے مجبور انسان

اب یہاں جبر کی سرکار نہیں چل سکتی!
آلِ شدّاد کی یلغار نہیں چل سکتی
مِل کا مالک ہو کہ جاگیر کا والی کوئی
اب شہنشاہیٔ زردار نہیں چل سکتی

اب کوئی رکھ نہیں سکتا مری مِلّت کو غلام
جاگ اُٹھے ہیں مرے دیس کے مجبور عوام

---

شیش محلوں کے مکینوں کو خبر دیتا ہوں
سنگ، ہاتھوں میں لئے کٹیا نشیں آتے ہیں

اس سے پہلے کہ وہ محلوں کو بنا دیں کھنڈر
اور پیوندِ زمیں ہوں یہ عمارات عظیم
اس سے پہلے کہ تہہ و بالا ہوں زر کے کعبے
اور خونخوار دیوتاؤں کے ڈھ جائیں حریم

اس سے پہلے کہ تباہی کا بگولا اُٹھے،
اس سے پہلے کہ قیامت کی ہو تعذیبِ الیم

ٓ ٓ ٓ ٓ ٓ ٓ ٓ ٓ ظالمو!
ہم بتائے تمھیں دیتے ہیں، ذرا غور کرو
ظلم سے ہاتھ اگر کھینچ سکو، کھینچ ہی لو

---

شیش محلوں کے مکینوں کو خبر دیتا ہوں
جاگ اُٹھے ہیں مرے دیس کے مجبور عوام

لاکھ جکڑو ہمیں زنجیر و سلاسل میں مگر
اب نہ رُک پائیں گے ہم باغی جیالوں کے قدم
آفتاب اُبھرے گا، دھرتی کے سیاہ چہرے سے
انقلاب آئے گا، مِٹ جائیں گے یہ جور و ستم

اب بدل جائے گا صدیوں کا فرسودہ نظام
جاگ اُٹھے ہیں مرے دیس کے مجبور عوام

# گلگت و بلتستان میں اندھیر نگری چوپٹ راج ہے

طاہر خلیل

**۱۳ جنوری** کو خبر آئی کہ گلگت میں فوج نے ایک ہجوم پر گولی چلادی۔ جس کے نتیجے میں دو افراد ہلاک اور بہت سے زخمی ہوگئے۔ تفصیلات سے پتہ چلا کہ گذشتہ دنوں گلگت کے شہریوں نے پولیٹیکل ایجنٹ کی ناانصافیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف ایک احتجاجی جلوس نکالا تھا۔ سرکاری پریس نوٹ کے مطابق مظاہرین نے ڈی آئی جی کے مقرر کردہ ناردرن سکاؤٹس کے دستے پر پتھراؤ کیا۔ جس کے جواب میں مجبوراً مظاہرین پر گولی چلادی گئی۔ وزارت داخلہ کے جاری کردہ پریس نوٹ کے مطالعہ کے بعد کہیں بھی اس بات کی نشاندہی نہیں ہوتی کہ ہجوم نے کسی قسم کا تشدد کیا یا فوج کے دستوں پر مظاہرین نے پتھراؤ کیا ہو۔ مظاہرین کی جانب سے پتھراؤ سرکاری پریس نوٹ کی پرانی روایت ہے۔ اور طالب علموں یا محنت کشوں کے جلسوں اور جلوسوں کو ناکام کرنے کا جواز حکومت کی جانب سے ہمیشہ یہ کیا جاتا رہا ہے کہ مظاہرین نے پولیس پر پتھراؤ کیا۔ جس کے جواب میں "مجبوراً" پولیس کو گولی چلانا پڑی گلگت کے عوام پر اب تک جو مظالم ہوئے ہیں، انسانیت کی تاریخ اس سے کپکپا اٹھتی ہے۔ ان مظالم کی تاریخ اس قدر طویل ہے کہ انہیں چند الفاظ میں رقم کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

گلگت، بلتستان، پاکستان کا سب سے پسماندہ اور دور دراز علاقہ ہے۔ یہاں کے جفاکش اور محنت کش شہریوں نے شاید ہی تین وقت کا کھانا کسی دن پیٹ بھر کر کھایا ہو۔ یہاں کے مجبور و مظلوم عوام کی حالت دیکھ کر قرون وسطیٰ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اور آج جبکہ اس ترقی یافتہ دور اور انسانی شرف کے اعلیٰ معراج میں انسانیت کے ساتھ یہ دلدوز سلوک دیکھا جاتا ہے تو روح کپکپا اٹھتی ہے۔



نیم تن در گور دارم، نیم تن در زندگی

گلگت بلتستان ایک شاندار ماضی کا حامل ہے یہ علاقہ قیام پاکستان تک ریاست جموں و کشمیر کا ایک صوبہ تھا۔ جغرافیائی لحاظ سے اس علاقے کے شمال میں عوامی جمہوریہ چین کا مشہور صوبہ سنکیانگ ہے۔ شمال مغرب میں افغانستان، مغرب اور جنوب مغرب میں مغربی پاکستان کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے۔ جنوب میں وادی کشمیر اور مشرق و جنوب مشرق میں مقبوضہ کشمیر کا ضلع لداخ ہے۔ روس اور گلگت ایجنسی کی سرحدوں کے درمیان چین اور افغانستان کے پندرہ بیس میل چوڑے علاقے ہیں۔ ان علاقوں میں صدیوں سے چھوٹی چھوٹی خودمختار حکمران عوام پر حکومت کرتے رہے۔ اور غلامانہ دور صدیوں سے جاری ہے۔ انگریز سامراج اور حملہ آور ڈوگرہ فوجوں کے لئے کشمیر کے علاقے میں گلگت و بلتستان ایسا مقام تھا جس کے حصول کے لئے انہیں سخت جنگ لڑنا پڑی یہاں کے بہادر، جنگجو اور سامراج دشمن عوام نے ڈوگرائی فوجوں کے دانت کھٹے کر دیئے تو ڈوگروں نے براہ راست حملہ کی پالیسی ترک کر کے گلگت کے چند ضمیر فروش عناصر کو بھاری رقوم دے کر اپنے ساتھ ملالیا۔ عیاری اور مکاری سے کام لے کر انہوں نے عوام میں پھوٹ ڈال کر حکومت قائم کر ڈالی۔ یہ ۱۸۴۶ء کا دور تھا جب انگریزوں نے راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں کشمیر فروخت کیا تھا۔ اس زمانہ میں گلگت میں راجہ گوہر امان

# گلگت کے عوام ووٹ کے حق سے ابھی تک محروم ہیں

اور بلتستان کے راجہ احمد شاہ اپنے علاقوں میں سامراج دشمن کردار کی وجہ سے ایک نمایاں حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ ان دونوں رہنماؤں نے انگریز سامراجیوں اور ڈوگرہ حملہ آور فوجوں کے خلاف زبردست اور قابل فخر جدوجہد کی۔ جس کی بنا پر مسلسل ۴۶ سال تک ڈوگرہ فوج اس علاقے پر قبضہ نہ کر سکی۔

قیام پاکستان کے وقت گلگت و بلتستان، جموں وکشمیر کی ریاست کا ایک حصہ تھا۔ اور یہ ریاست رقبہ کے لحاظ سے برصغیر کی سب سے بڑی ریاست اور آبادی کے لحاظ سے چوتھے نمبر پر تھی۔ آزادیٔ ہند کے قانون ۱۹۴۷ء کی رو سے ہر ریاست کے راجے یا مہاراجے کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ خواہ پاکستان یا بھارت سے الحاق رکھیں یا آزاد ہو جائیں۔ ریاست جموں وکشمیر کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ جو کسی بھی صورت بھارت سے الحاق نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن کانگریسی لیڈروں، بھارت کے انگریز گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور مہاراجہ کشمیر کی ملی بھگت سے کشمیر کا الحاق بھارت سے کرانے کی سازش کی گئی۔ اس سازش کے عملی جامہ پہنائے جانے سے پہلے ہی ضلع پونچھ کے بہادر عوام نے کشمیری مہاراجہ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ اور اس علاقے میں ایک آزاد عبوری حکومت قائم کر ڈالی۔ جب مہاراجہ نے الحاق کشمیر کا اعلان بھارت سے کر دیا اور الحاق کی خبر گلگت پہنچی تو یہاں کے غیور اور سامراج دشمن عوام نے بھی علم بغاوت بلند کر کے اور فوج کے ایک حصے کی مدد سے گورنر ہاؤس پر قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح گلگت میں بھی ایک متوازی حکومت قائم کر ڈالی۔ جس کا نام جمہوریہ گلگت رکھا گیا۔ یہ جمہوریہ ۲ نومبر سے ۱۹ نومبر تک قائم رہی۔ بعد میں حکومت پاکستان نے اپنا ایک پولیٹیکل ایجنٹ بھیج کر اس کا نظم ونسق سنبھال لیا۔

گلگت کی آزادی کے بعد یہاں کے عوام اور اسکاؤٹس (جو کہ فوج کی ایک تشکل ہے) نے بلتستان کا رخ کیا۔ اور بلتستان کے صدر مقام اسکردو پر قبضہ کے بعد کرگل تک پہنچ گئے۔ اس موقع پر اقوام متحدہ حرکت میں آئی اور اس نے پیش قدمی روک دی۔ اگر اقوام متحدہ اس وقت مداخلت نہ کرتی تو آج پوری ریاست جموں وکشمیر بھارتی غاصبوں سے آزاد ہو چکی ہوتی۔

گلگت و بلتستان کے عوام نے آزادی کی جنگ جس طرح لڑی ہے وہ عوامی جنگوں کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ بہادر عوام نے ڈنڈوں، کلہاڑیوں تلواروں اور برچھیوں سے جدید اسلحہ سے لیس تقریباً پندرہ ہزار بھارتی ڈوگرائی فوج کا زبردست مقابلہ کیا۔ چھ چھ فٹ برف کے تودوں میں خوراک اور رسل و رسائل کے انتظامات نہ ہونے کے باوجود بھارتی افواج کو مار بھگایا۔ اور اس طرح ریاست کے ۸۵ ہزار مربع میل کے علاقے میں سے ۳۰ ہزار مربع میل کا علاقہ آزاد کرا لیا۔ جنگ آزادی کی اس عظیم جدوجہد میں انہیں کسی قسم کی بیرونی امداد کا سہارا حاصل نہیں تھا۔ یہ عوامی جدوجہد حب الوطنی اور بہادری کی تاریخ میں انہوں نے نئے اور درخشندہ باب کا اضافہ کیا۔

حکومت پاکستان نے گلگت و بلتستان کا نظم و نسق سنبھالنے کے بعد یہاں ایف سی آر جیسا بدنام زمانہ قانون نافذ کر دیا۔ یہ قانون اس سے قبل انگریز سامراج نے سرحد کے عوام کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے نافذ کیا تھا۔ اس رسوائے زمانہ قانون کی آڑ میں یہاں کے عوام پر ظلم وستم کا نیا سلسلہ شروع کیا گیا۔ یہاں کے عوام تمام جمہوری حقوق سے محروم ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد آج تک اس علاقے کے کسی بھی شہری کو کسی اسمبلی میں نمائندگی کا حق نہیں دیا گیا۔ گلگت و بلتستان کے عوام سے وہ آزادی جو ڈوگرائی اور انگریز سامراجیوں کے خلاف نبرد آزما ہو کر حاصل کی تھی آج ان سے جبراً چھین لی گئی ہے۔

پاکستان میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات مکمل ہو چکے ہیں، آزاد کشمیر کی ریاستی اسمبلی کے ارکان بھی منتخب ہو کر اسمبلی میں جا چکے ہیں۔ لیکن گلگت و بلتستان کے عوام آج ووٹ کے جمہوری حق کو ترس رہے ہیں۔ گزشتہ ماہ اخبارات میں ایک ہی قسم کی تصویر کو نمایاں طور پر شائع کیا گیا۔ جس میں گلگت کے عوام کو "مشاورتی کونسل" کے انتخابات کے لئے ووٹ دیتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ گلگت و بلتستان کے سینکڑوں شہری جو تجارتی مقاصد کے لئے راولپنڈی آتے جاتے رہتے ہیں آج تک حیران ہیں کہ یہ انتخابات کب ہوتے؟ کہاں ہوئے؟ اور مشاورتی کونسل نام کی کوئی چیز ہے بھی یا نہیں؟

گلگت و بلتستان کے چھ لاکھ شہری آج حکومت پاکستان سے یہ پوچھتے ہیں، کہ کیا گلگت کے سینکڑوں نوجوانوں نے اپنی جانیں اس لئے قربان کی تھیں کہ وہ بنیادی جمہوری حقوق سے محروم رہیں؟ کیا انہوں نے آزادی کی جنگ اس لئے لڑی تھی کہ ان کی قسمت کا فیصلہ حکومت پاکستان کی وزارت امور کشمیر و داخلہ کے چند بدعنوان اور ضمیر فروش افسران کے ہاتھوں کا کھیل رہے؟ اور کیا گلگت کے بہادر اور غیور عوام نے ٹوٹی پھوٹی تلواروں کو ہاتھوں میں لے کر سامراج سے اس لئے جنگ لڑی تھی کہ وہ پاکستان کی نوکر شاہی کے زرخرید غلاموں کا کردار ادا کر سکیں؟ آج گلگت کے چھ لاکھ عوام سراپا احتجاج بن چکے ہیں، انہیں نہ تو پاکستان اور نہ ہی آزاد کشمیر میں ووٹ دینے کا حق دیا گیا ہے۔

گلگت میں ضروریات زندگی کی قیمتیں جس قدر زیادہ ہیں اس سے وہاں کے سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکر شاہی کے ظلم وتشدد اور استحصال کا اندازہ ہوتا

**گلگت کے طلبا تعلیمی وظائف کے لئے وزارت داخلہ وامور کشمیر کے دفتر کے گرد چکر لگاتے نظر آتے ہیں**



# یہاں نمک کی قیمت ڈیڑھ روپے سیر ہے

ہے۔ گزشتہ تیئیس برس سے اشیاء صرف کی قیمتیں کچھ اس طرح ہیں :۔ نمک ڈیڑھ روپے سیر، گندم ساٹھ سے اسّی روپے من، چینی تین سے چار روپے سیر، مٹی کے تیل کی بوتل ایک روپے فی عدد، اور راولپنڈی میں ایک روپے فی گز فروخت ہونے والا کپڑا چار روپے فی گز کے حساب سے فروخت ہوتا ہے۔ اس مختصر موازنے سے سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ گلگت و بلتستان ایشیا کا واحد خطہ ہے جہاں کی فی کس آمدنی سب سے کم ہے۔

گلگت کی ایجنسی میں ہنزہ اور نگر دو ریاستیں ہیں، جہاں میروں کی حکمرانی ہے۔ میر اور ہنزہ راولپنڈی میں سیٹلائٹ ٹاؤن کے علاقے میں مقیم ہیں۔ ہنزہ کے شہزادوں کی "عیاشی" کی داستانیں یہاں کے عوام سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ایوب خان سے قریبی رابطہ کی بنا پر اس خاندان نے برسوں تک راولپنڈی کے شہریوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھا۔ ان ریاستوں میں رہنے والے عوام غلامانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ گزشتہ سال اپریل میں بھی نگر کی ریاست میں عوام کے ایک "ہجوم" پر گولی چلائی گئی تھی۔ جس سے سولہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ اس فائرنگ کی آج تک کوئی تحقیقات نہیں کرائی گئی۔ بنیادی حقوق کے لئے آواز نکالنے والے ہر شخص کو تین سے بارہ سال تک قید خانوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ تعلیمی لحاظ سے یہ علاقہ انتہائی پسماندہ ہے۔ آزاد کشمیر میں مقیم زیر تعلیم طلبہ کو دو سال گزر جانے کے بعد بھی تعلیمی وظائف نہیں ملے۔ جس کی بنا پر وہ اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے۔ اور شدید مالی بحران سے دوچار یہ طلبہ آج بھی وزارت امور کشمیر اسلام آباد کے گرد چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔

گلگت کے عوام آج بھی اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں حق رائے دہی اور آزاد کشمیر اسمبلی میں انہیں بھی نمائندگی دی جائے۔ گلگت و بلتستان سے رسوائے زمانہ ایف سی آر کا مکمل خاتمہ کیا جائے اور آزاد کشمیر ہائیکورٹ کا دائرہ اختیار گلگت ایجنسی تک بڑھا دیا جائے۔ ہنزہ اور نگر کی ریاستوں میں شخصی راج ختم کر کے انہیں بھی گلگت میں شامل کیا جائے۔ پاکستان اور آزاد کشمیر میں مقیم زیر تعلیم طلبہ کو باقاعدگی سے وظائف دیئے جائیں اور طلبہ کو ہوائی سفر میں مناسب رعایت دی جائے۔ گلگت اور اسکردو کے انٹرمیڈیٹ کالجوں کو ڈگری کا درجہ دیا جائے اور گلگت میں ہونے والی حالیہ اور نگر کی گزشتہ فائرنگ کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے۔ رشوت ستانی، اقربا پروری اور انتظامی بدعنوانیوں کی روک تھام کے لئے سخت اقدامات کئے جائیں۔ اور گلگت ایجنسی کے لئے حکومت پاکستان نے جو مشاورتی کونسل تشکیل کی ہے اس کے اختیارات بڑھائے جائیں۔ یہ مشاورتی کونسل صرف برائے نام ہے۔ اسے قانون سازی اور انتظامیہ کے معاملات کی دیکھ بھال کا کوئی حق نہیں ہے۔ [illegible] کونسل کا کام صرف مشورے دینا ہے۔

امریکی سامراج پوری دنیا کی معدنی دولت کو ہڑپ کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے

# کینیڈا، امریکہ کی اکیاونوی ریاست بن جائے گا؟

عباس رضوی

کینیڈا کے سیاسی حلقوں میں یہ خیال سانپ کی طرح سرسرا رہا ہے کہ کینیڈا کہیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اکیاونوی ریاست نہ بن کر رہ جائے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی آبادی اگرچہ دنیا کی مجموعی آبادی کا ۶ ½ فیصد ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ملک اس کرۂ ارضی کی مجموعی پیداواری قوتوں کا پچاس فیصد اپنے تصرف میں لاتا ہے۔ اس ملک کے ایک شہری پر روزانہ جتنا خرچ آتا ہے وہ دنیا کے دیگر افراد پر فی کس خرچ سے آٹھ گنا زیادہ ہے۔ امریکہ کو یہ بھلا نہیں لگتا اور اپنے ملک میں سب کچھ ہوتے ہوتے بھی اسے ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔

امریکہ کی یہ حالت ہے کہ دنیا میں اس وقت جتنے ٹیلی فون موجود ہیں، ان کا پچاس فی صدی استعمال امریکی کرتے ہیں۔ جتنے بجلی سے چلنے والے فرج ہیں، ان کی مجموعی تعداد کا ساٹھ فیصدی ان کے گھروں میں موجود ہے۔ جتنے ٹیلی ویژن موجود ہیں ان کا ستر فیصدی ان کے بچے دیکھتے ہیں۔ جتنے کمپیوٹر ہیں ان کی نوے فی صدی تعداد ان کے دفاتر میں موجود ہے۔ امریکہ کی سڑکوں پر دوڑنے والی موٹروں اور کاروں کی تعداد اس وقت ایک ارب کے قریب ہے۔ نیز ان کی تعداد میں ایک کروڑ سالانہ کی رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے۔

لیکن امریکہ ہے کہ اس ریل پیل کے باوجود مطمئن نہیں۔ مشینوں، موٹروں، اور آلوں کی شکل میں دنیا کی مجموعی پیداوار کی پچاس فیصدی دھات، ایندھن، توانائی، معدنیات، کیمیاوی اشیاء اور پلاسٹک انہی کی ملکیت ہے۔ وہ دنیا میں پیدا ہونے والی ہیر کی مجموعی مقدار کا پچیس فی صدی پی جانے کے باوجود بھی بھوکا ہے۔ وہ پیداواری قوتوں پر زیادہ سے زیادہ قابض ہونے کے لئے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے کے منصوبے بنا رہا ہے۔

امریکہ چاہتا ہے کہ ۱۹۸۰ء تک اس کی مجموعی قومی پیداوار ۲۰ کھرب ڈالر سے بڑھ کر سو کھرب ڈالر تک پہنچ جائے۔ اندازہ ہے کہ امریکہ ترقی کی اس منزل تک پہنچنے کے لئے دنیا کی مجموعی پیداواری قوت کا تقریباً ۸۰ فیصدی اپنے تصرف میں لائے گا۔ پیداواری قوتوں کی اس لوٹ کھسوٹ میں امریکہ کینیڈا کے ذرائع پیداوار کا استحصال کس حد تک لے جائے گا۔ کینیڈا کے دانشور اس سوال کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایک قوم کے ہاتھوں دوسری قوموں کے ذرائع پیداوار کی لوٹ کھسوٹ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے پہلے بھی کتنی بڑی طاقتیں دنیا کے نقشے پر ابھری ہیں۔ مثلاً یونان اور برطانیہ ان طاقتوں نے دیگر ملکوں کی دولت لوٹی ہے۔ لیکن کل تک جو بات جنگوں اور قزاقی کے ذریعے ہوتی تھی، وہ بات آج سیاسی دباؤ، سودے بازی اور سرمایہ کاری کے ذریعے ہوتی ہے۔ امریکہ بھی اگرچہ اب دوسرے ذریعے کو پہلے ذریعے پر ترجیح دیتا ہے۔ لیکن اس نے جنگ اور قزاقی کے طریقہ ہائے کار مکمل طور پر ترک نہیں کئے۔

کینیڈا کے معاملہ میں امریکہ اس حد تک آگے نہیں جائے گا۔ کینیڈا کی پیداواری قوتوں کی لوٹ کھسوٹ کے لئے امریکہ سیاسی دباؤ، سودا بازی اور سرمایہ کاری کے ذریعے آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ بے شمار امریکی کارپوریشنیں ہیں جو اس وقت کینیڈا کے ذرائع پیداوار کا استحصال کر رہی ہیں۔ سنہ ۱۹۷۰ء تک امریکی کارپوریشنوں نے جو دولت کینیڈا سے لوٹ کر امریکہ پہنچائی وہ درج ذیل ہے:

یورینیم ۲ ہزار ٹن، کچا لوہا تین کروڑ ٹن، سیسہ ۲۵ ہزار ٹن، تانبہ ایک لاکھ پندرہ ہزار ٹن، پوٹاشیم ۳ لاکھ ٹن، جست ایک لاکھ ۶۰ ہزار ٹن، پارہ ۵۰ ہزار فلاسک (۷۶ ہزار پاؤنڈ فی فلاسک) سونا ۳۰ لاکھ ٹوری آونس، پٹرول ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ بیرل، قدرتی گیس ۲۶،۱ ٹریلین کیوبک فیٹ۔

متذکرہ اشیاء کی وہ مقدار جو امریکہ ۱۹۸۰ء تک کینیڈا کے پیداواری ذرائع سے کھینچ کر لے جانا چاہتا ہے:

یورینیم (۵۰٪) کچا لوہا (۸۰ فیصد) سیسہ (۵۵ فیصد) پارہ (۱۵ فیصد) تانبہ (۳۳ فی صد) پوٹاش (۹۸ فیصد) جست (۵۰ فیصد) سونا (۹۸ ٹوری آونس) پٹرول (۹۵ فیصد) قدرتی گیس (۹۸ کیوبک فیٹ)

مندرجہ بالا گوشوارے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ اگر کینیڈا کی پیداواری قوتوں کو اسی رفتار سے لوٹتا رہا تو ۱۹۹۰ء تک کینیڈا کے بعض بڑی اہم پیداواری قوتوں لوہا، پوٹاش، سونا، پٹرول اور قدرتی گیس پر سو فیصد قابض ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو کینیڈا کی اپنی لوہے، پوٹاش اور سونے کی صنعتیں ختم نہ ہوئیں تو محدود ہو کر رہ جائیں گی اور کینیڈا پٹرول، قدرتی گیس جیسے اہم ایندھن سے پوری طرح محروم ہو جائے گا۔

لیکن کینیڈا کی داخلی اور خارجی صورت حال میں گذشتہ چند سالوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کینیڈا کے عوام یہ نہیں چاہتے کہ ان کا ملک ریاست ہائے متحدہ کی اکیاونوی ریاست بن کر رہ جائے۔ چنانچہ کینیڈا کی حکومت نے ملک میں

باقی صفحہ ۴۲ پر

# ائیر پورٹ پر پیاسی کی لاش سڑ رہی ہے

**وقائع نویس**

"میں نے حافظ اقبال اور شیخ مجید کو منع کیا تھا، انہوں نے میری بات نہیں مانی۔ وہ آخری حربہ استعمال کر چکے ہیں۔ یونین کی طاقت کا اندازہ ہوگیا ہے۔ اب نرمی نہیں برتی جائے گی۔ آپ گھر والوں کو بتا دیں کہ جتنے پیسے ملتے ہیں ان میں کام چلائیں۔ افسروں کو پتہ چل گیا ہے کہ پی آئی اے کو کتنے آدمیوں کی ضرورت ہے۔"

یہ الفاظ مسٹر قمر الزماں جنرل مینجر پی آئی اے کراچی کے ہیں۔ ۱۷ جنوری کو تین بجے سہ پہر اسٹاف کی ایک میٹنگ ہوئی تھی۔ اس میں ہڑتال سے پہلے اور بعد کے مسٹر قمر الزماں ملازمین سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے سہمے اور دبکے ہوئے ملازمین کے سامنے حالات کا ایسا نقشہ کھینچا کہ اجلاس ختم ہونے کے بعد بھی ان کے کانوں میں انتظامیہ کے لامحدود اختیارات گونجتے رہے۔ ذہن میں کتنے آدمیوں کی ضرورت ہے؟ کتنے آدمیوں کی ضرورت ہے؟..... بار بار سوالیہ نشان بنتے رہے۔

بے بسی نے پی آئی اے کے ملازمین کو شاید پہلی بار اس قدر پریشان کیا کہ انہیں ملازمت جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ سیٹ چھوڑنے سے پہلے پرچی لیں یا نہیں۔ کھانے پر جانے کے لئے پرچی، چائے کی طلب پوری کرنے کے لئے پرچی، رفع حاجت کے لئے پرچی، ایک بار سوچتے ہیں کہ تکمیل برداشت نہیں کی جا سکتی۔ بھلا کسی کارخانے کے مزدور تو نہیں پی آئی اے کے ملازم ہیں۔ ڈیڑھ ہزار، ایک ہزار، پانچ سو اور کم از کم تقریباً ایک تنخواہ ملتی ہے۔ یہ تو شرمندہ کرنیوالی بات ہے، ذلیل کر رہے ہیں۔ دبانا چاہتے ہیں۔

فوراً دوسری سوچ گھیر لیتی ہے کہ ملازمت چھوڑ دی جائے۔ بے روزگاری میں بچوں کو انگریزی طرز کے اسکولوں سے اٹھانا پڑے گا۔ مکان چھوڑ کر لانڈھی، منگھوپیر، شیر شاہ، کورنگی، پٹھان کالونی، محمود آباد، ٹین کوارٹر، لالہ سینیا لائنز، گورنمنٹ کوارٹرز تبدیل ہونا پڑے گا۔ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ پرچی لے لو، بے روزگاری میں تو کوئی پاس تک پھٹکنے نہیں دیتا۔ ماں باپ، بہن بھائی، عزیز رشتے دار ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ پی آئی اے کی ملازمت کہاں ملتی ہے۔ سر نیچا کر کے کام نکالو۔ پیاسی نے تو کہیں کا بھی نہیں چھوڑا اس سے پہلے..... چھوڑو یونین کا خیال تک نہ کرو۔ ملازمت کرو۔

پی آئی اے میں مزدور تحریک ایک شرمناک المیے سے دوچار ہے، انتظامیہ کارخانے کی ہو یا پی آئی اے کی، وہ مزدور کی کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے۔ اسے کچلنے میں تمام ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے۔ اسے بے بس کر کے دندناتی ہے لیکن مزدور متحد ہو، سیاسی بصیرت رکھتا ہو۔ استحصال کرنیوالوں سے بخوبی واقف ہو۔ مفاد پرستوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت کا مظاہرہ کر سکے تو پھر کارخانہ ہو یا پی آئی اے فیصلہ مزدور کے حق میں ہوتا ہے۔ اسے کیا کہئے کہ پی آئی اے کی انتظامیہ نے ایسے منصوبے کے تحت اپنا کاروبار چلایا کہ اس میں کام کرنے والے ملک کے عام مزدوروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو برتر سمجھتے رہے۔ تنخواہیں اور مراعات سے بہرہ ور ہوتے رہے۔ وہ مزدور تحریک یا مزدور برادری کا حصہ نہیں بن سکے۔ سفید پوش، کاروں کے مالک اور مراعات یافتہ پی آئی اے کے ملازمین میلے کچیلے، بسوں، سائیکلوں اور سڑکوں پر پیدل مسافت طے کرنیوالے، فاقہ کشی اور تنگدستی کا شکار ہونے والے، اپنے حقوق کے لئے پولیس کی گولیوں کا نشانہ بننے والے، ظلم اور استحصال کی چکی میں پسنے والے مزدوروں سے الگ تھلگ رہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ان کے مطالبات پیش ہوئے اور منظور ہو گئے۔ اس طرح پی آئی اے کے ملازمین کے معاشی مسائل حل ہوتے رہے۔ اور انہیں جدوجہد سے کوئی واسطہ نہ پڑا۔ ایک مراعات یافتہ طبقہ جنم لیتا رہا۔

اس سونے کی چڑیا پر "اسلام پسندوں" کی بہت پرانی نظر تھی۔ انہوں نے مسلسل پی آئی اے کی نبض پر ہاتھ رکھا، مارشل لاء نافذ ہوا تو انہوں نے پی آئی اے اور دوسرے صنعتی اداروں میں حالات کو سازگار پایا۔ منظور شدہ اخبارات نے پی آئی اے میں اسلام پسند یونین کے لئے اپنے صفحات وقف کر دیئے۔ مخالف یونین ایئو پیا کے رہنماؤں کے خلاف شر انگیز اور بے بنیاد مہم کو پروان چڑھایا۔ اس مقصد کے لئے اخباری صنعت کے نام نہاد اسلام پسندوں نے منظم طور پر کام کیا۔ نیشنل پریس ٹرسٹ کے سب سے بڑے اردو روزنامہ مشرق کے دو اہم عہدیدار اس میں پیش پیش تھے۔ ان میں سے ایک کا تعلق کراچی اور دوسرے کا لاہور سے تھا۔

پیاسی کے لئے روزنامہ مشرق کراچی کے اس وقت کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر مسٹر عرفان غازی نے ذاتی طور پر نہ صرف دلچسپی لی بلکہ مشرق کراچی کے عملے میں ان عامل صحافی کارکنوں کو انتقامی کارروائی کا سامنا کرنا پڑا جو پیاسی کے جنرل سیکرٹری مسٹر مجید شیخ کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے۔ مشرق کے مینیجنگ ڈائریکٹر مسٹر عنایت اللہ نے پیاسی کے متعدد وفود سے ملاقات کیں اور اس طرح پیاسی کو نیشنل پریس ٹرسٹ کا ایک روزنامہ تشہیری مقاصد کے لئے میسر آگیا۔ لاہور میں نیشنل یونین آف جرنلسٹس کے سرغنہ مسٹر ضیاء الاسلام انصاری نے پیاسی کے مقاصد کی تکمیل کی۔

پیاسی اور اسلام پسند صحافیوں کے گٹھ جوڑ کا انکشاف اس دستاویز سے ہوا جو مسٹر محمود احمد نے راولپنڈی سے جنگ کے نیوز ایڈیٹر مسٹر محمود احمد مدنی کے نام ارسال کی

# مزدور تحریک پی آئی اے میں شرمناک المیے سے دوچار ہے

تھی۔ اس دستاویز میں جہاں صحافیوں کی ملک گیر تنظیم کے بارے میں زیر زمین سرگرمیوں کی ہدایات جاری کی گئی تھیں وہاں لیپے اور پیاسی کے تعلقات کا تذکرہ بھی کیا گیا تھا۔ پاکستان کے صحافیوں کی واحد نمائندہ تنظیم پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کو توڑنے کے سلسلے میں کی جانے والی کارروائیوں سے پتہ چلا کہ پاکستان بھر کی عوام دوست طاقتوں کو کچلنے کی جو سازش تیار کی گئی ہے اس میں صنعت کار، نوکر شاہی اور سامراجی ایجنٹ شامل ہیں۔ اس سازش کے تحت مغربی پاکستان میں وسیع پیمانے پر ان مزدور تنظیموں کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں جو جماعت اسلامی کے زیر اثر نہ تھیں۔

پیاسی اس سازش کی پہلی پیداوار ثابت ہوئی۔ پی آئی اے میں ریفرنڈم کے نام پر ڈرامہ کھیلا گیا۔ اور منصوبے کے مطابق پیاسی کو اجتماعی سودا کاری کا ایجنٹ قرار دے دیا گیا۔ یہ تنظیم مخصوص مفادات کے تحفظ کے لئے قائم ہوئی تھی۔ لہٰذا اس نے پی آئی اے کے ملازمین کے حقوق کی طرف توجہ نہ دی اور اس ادارے کے دس ہزار ملازمین کی طاقت کو جماعت اسلامی کے سیاسی اقتدار کے لئے استعمال کیا۔ پی آئی اے جیسا قومی ادارہ آن کی آن میں مودودیوں کا اکھاڑہ بن گیا۔ وہ لوگ جو پیاسی کے مخالف تھے، ان کے خلاف انتقامی کارروائیاں کی گئیں۔ ستر کے لگ بھگ ملازمین کو سبکدوش کر دیا گیا۔ انتظامیہ کا ہر افسر اپنی عزت بچانے اور صنعتی امن برقرار رکھنے کے لئے پیاسی کے عہدیداروں کے احکامات کی تعمیل کرنے پر مجبور تھا۔

پیاسی ریفرنڈم میں کیا جیتی، کراچی ائیرپورٹ عام مسافروں تک کے لئے محفوظ نہ رہا۔ ائیرپورٹ "سوشلسٹوں کا قبرستان"۔ "پاکستان پاکستان" کے نعروں سے نیپ بھاشانی کے رہنماؤں کی پٹائی سے لے کر پولینڈ کے صدر پر قاتلانہ حملے اور نائب وزیر خارجہ کے قتل تک گونجتا رہا۔ پیاسی والوں نے اکرم بھٹی کی قیادت میں جب بھی خون کی ہولی کھیلنا چاہی اسے یہ کہہ کر شہ دی گئی کہ مخالف (نعوذ باللہ) اسلام کے خلاف باتیں کر رہے تھے، کافروں اور اسلام دشمنوں کا بھیس دے کر ... اور مار پیٹ کا ہنگامہ تھا کہ لوگ حیران ہو جاتے تھے۔ ... ہ گردی پر پی آئی اے کی انتظامیہ کی خاموشی پر ملک کا ہر شہری شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ قومی فضائی کارپوریشن کے بھی شب و روز ہے تو اللہ مالک ہے۔

پیاسی کے اہم عہدیداروں کو پی آئی اے نے شاید وہ مراعات نہ دی ہوں جن سے وہ بہرہ ور ہو رہے تھے ٹیلی فون برقیات، ٹرانسپورٹ اور ہوائی سفر کی اندھا دھند سہولتیں تھیں۔ پی آئی اے کی عمارت پر کارپوریشن کے جھنڈے کے ساتھ پیاسی کا جھنڈا لہراتا تھا۔ جماعت اسلامی کے یوم شوکتِ اسلام کو اس انداز میں منایا گیا کہ اس میں پی آئی اے سرکاری طور پر ایک فریق بنی ہوئی تھی۔ عوام دوست اخبارات نے اس جانب پی آئی اے کی انتظامیہ کی توجہ مبذول کرائی لیکن کوئی مثبت نتائج برآمد نہ ہو سکے۔

سفید پوش یونین کے کارکن پیاسی کی ان تمام سرگرمیوں کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ ان کی اکثریت نے پیاسی سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں، بلکہ ان کی بجائے جماعت اسلامی کی ہدایات پر عمل نے عام کارکنوں میں پیاسی کے خلاف نفرت پیدا کر دی۔ ایوپیا کے ستر ارکان کی پیاسی کے اشارے پر سبکدوشی نے جہاں ملازمین کو یہ تاثر دیا کہ اجتماعی سودا کاری کی ایجنٹ یونین بہت اثر رکھتی ہے، وہاں ان جذبات نے بھی جنم لیا کہ یونین کے عہدیدار سیاسی مقاصد کی تکمیل کی خاطر قتل عام سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

پولینڈ کے صدر پر قاتلانہ حملے اور نائب وزیر خارجہ کے قتل کے واقعہ سے ملک بھر میں پیاسی کے خلاف شدید ردِ عمل ہوا تو پی آئی اے کے ملازمین کی مزید آنکھیں کھلیں کہ ان کی یونین اس حد تک آلۂ کار بن چکی ہے۔ کہ اس کا ایک رکن ملک کی عزت سے کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ یہاں سے پیاسی کے زوال کو شدید ٹھوکر لگتی ہے۔ انتظامیہ چوکنی ہو جاتی ہے۔ بریگیڈیئر حمید الدین ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن کا چارج سنبھالتے ہیں۔ پی آئی اے کی عمارت پر سے پیاسی کا جھنڈا اتار دیا جاتا ہے۔ پیاسی کے تین عہدیدار برطرف ہو جاتے ہیں۔ یونین نے جن مراعات پر قبضہ کیا تھا وہ چھین لی جاتی ہیں اور حافظ اقبال چیخ اٹھتے ہیں "پیاسی کو بچانے کے لئے ہڑتال کے سوا کوئی چارہ نہیں"۔

یہ سب کچھ انتخابات کے بعد ہوا۔ انتخابات سے قبل ملک کے تمام اداروں کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ جماعت اسلامی کے لئے اقتدار کی کرسی خالی ہونے والی ہے چونکہ ۲۳ سال سے اربابِ اختیار کا تعلق صرف اقتدار کے حصول کے لئے مخصوص طبقے سے رہا ہے لہٰذا انتخابات میں بھی اسی خاص طبقے کے رجحان سے نتیجہ اخذ کر لیا گیا۔ عوام کا فیصلہ انتخابات کے نتائج کی صورت میں رونما ہوا تو نقشوں پر سے تیر بدلنے پڑے۔ امریکی سامراج کے پٹھوؤں کی صفوں میں ماتم برپا ہو گیا۔ سیاسی محاذ پر نام نہاد اسلام پسندوں کی "مال و زر" جماعت اسلامی کی عبرت ناک شکست نے واشنگٹن سے اچھرہ تک صفِ ماتم بچھائی تو اس کا اثر جماعت کے ہر محاذ پر پڑا۔ بہتر تو یہ تھا کہ جماعت کی لیڈر شپ دانشمندی سے کام لیتی لیکن بوکھلاہٹ اور پاکستان کو انڈونیشیا بنانے کی اسکیم کے ہاتھوں مجبور تھی۔ فوراً اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے مورچے سنبھال لئے۔ نوکر شاہی نے مکمل وفاداری کا مظاہرہ کیا اور روزمرہ کی اشیاء کی قیمتوں کی سطح اتنی بلند کر دی کہ روٹی، کپڑا اور مکان مانگنے والے انتخابات سے پہلے کی سہولتوں سے بھی محروم ہو گئے۔ بے چینی پھیلی تو مظاہروں کو تخریب دیا توڑ پھوڑ کروائی تو عوام دوستی کو دیکھے کہ دلآزار کتاب کے خلاف جتنا بھی ردِ عمل ہو کم ہے۔ لیکن اس سے جماعت اسلامی کے مقاصد پورے ہو رہے ہیں۔ پھر کیا تھا، مظاہرے ختم ہو گئے۔

**روزنامہ مشرق کے**
**دو اہم عہدیداران**
**نے ایوپیا کے خلاف**
**مہم میں**
**بڑھ چڑھ کر**
**حصہ لیا**



# جماعتِ مودودی نے پی آئی اے کے بعد دوسری جگہوں پر بھی ہڑتال کا پروگرام بنایا تھا

جماعت مزدور محاذ پر نظر دوڑائی۔ پیاسی سب سے بڑا مورچہ تھا۔ مجید شیخ اور حافظ اقبال کی ڈور غوث محی الدین کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے ہائی کمان کے فیصلے سے آگاہ گیا۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ ملک گیر کمر توڑ مہنگائی نے پی۔ آئی۔ اے ملازمین کو بھی متاثر کیا ہے لہٰذا بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ پی۔ آئی۔ اے میں ہڑتال کامیاب ہو گئی تو پھر اللہ دے اور ہم لیں۔ اس وقت جماعت کو صرف اور صرف مزدور محاذ ہی بچا سکتا ہے فیصلہ ہوا کہ اچانک ہڑتال کروا دی جائے اور اسے کامیاب بنانے کے لئے وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کئے جائیں جو ریفرنڈم کے دوران آزمائے جا چکے ہیں۔ پی۔ آئی۔ اے کی انتظامیہ ایک دن سے زیادہ ہڑتال برداشت نہیں کر سکتی۔

پی۔ آئی۔ اے کے ملازمین اس منصوبے سے بالکل بے خبر تھے۔ اس پر عملدر آمد کرانے کے لئے پیاسی کے عہدیداروں نے ٹریفک سیکشن کو اعتماد میں لیا اور انہیں یہ ظاہر کیا ہڑتال اس بناء پر کی جا رہی ہے کہ ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن نے ڈیوٹی کے اوقات ۱۲ گھنٹے کی بجائے ۸ گھنٹے کر دیئے ہیں۔ (یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ۱۲ گھنٹے کی ڈیوٹی کی صورت میں ٹریفک کے کارکنوں کا اوور ٹائم تنخواہ سے زیادہ بن جاتا تھا۔ نئے شیڈول میں اوور ٹائم کی گنجائش ختم کر دی گئی تھی یا دقت ضرورت اوور ٹائم پہ کام لیا جا سکتا تھا لیکن پرانے شیڈول میں اوور ٹائم مستقل آمدنی کی صورت اختیار کر چکا تھا یہ سہولت بھی صرف کراچی اسٹیشن پر کام کرنے والوں کو میسر تھی)

یونین نے اپنے اور جماعت کے ذرائع کی وساطت سے ہڑتال کے منصوبے کو آخری شکل دے دی صبح پانچ بجے ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ ملازمین میں بے چینی تو پہلے سے موجود تھی لہٰذا پہلے روز حاضری کم رہی تاہم یہ دن یونین کے ارباب حل و عقد سے یہ پوچھنے میں گزرا کہ ہڑتال کی وجہ کیا ہے۔ عہدیداروں نے یہ بیان کیا کہ؛

۱۔ برطرف کئے جانے والے تین عہدیداروں کو واپس لیا جائے۔

۲۔ ٹریفک کے اوقاتِ کار پہلے کے مطابق رہنے چاہیں۔

۳۔ یونین سے مراعات واپس نہ لی جائیں۔



پی۔ آئی۔ اے کی انتظامیہ کو موقع مل گیا کہ ہڑتال غیر قانونی ہے۔ افسروں نے لوڈروں سے لے کر تمام سطح کے کام خود کئے۔ پہلے روز محدود پیمانے پر پروازیں جاری ہی۔ دوسرے روز ملازمین کو پتہ چلا کہ یہاں بھی جماعت اسلامی کو زندہ رکھنے کا مسئلہ ہے تو انہوں نے دفتر ۔ ۔خ کیا لیکن اسٹار گیٹ اگو ٹھ ناتھا خان کے پل اور پی۔ آئی۔ اے کے گرد و نواح میں

> **ڈیوٹی پر جانے والوں**
> **کو روکنے کے لئے**
> **اسلام پسندوں نے**
> **مسلح غنڈے**
> **مقرر کئے تھے**

ڈیوٹی پر آنے والے ملازمین کو روکنے کے لئے پیاسی اور اس کے ہمدرد اسلام پسندوں کے مسلح افراد کھڑے تھے۔ وہ لاء اینڈ آرڈر کے حالات پیدا کرنا چاہتے تھے ایئرو ہیڈ امپلائز یونین کے وہ ملازمین جنہیں پیاسی نے انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا انہوں نے ہمت کی۔ ان میں سے وہ لوگ قابلِ مبارکباد ہیں جنہوں نے ملازمین کے ساتھ رہ کر جماعت اسلامی کے اس منصوبے کو بے نقاب کرایا اور یہ ثابت کیا کہ یہ ہڑتال پی۔ آئی۔ اے کے ملازمین کے معاشی مسائل حل کرنے کے لئے نہیں کی گئی بلکہ اس کا مقصد ملک کے صنعتی اداروں میں گڑبڑ پھیلانا ہے تاکہ عوام نے انتخابات کے دوران جو فیصلہ دیا ہے اسے مسترد کرایا جا سکے۔ سفید پوش یونین کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی مسائل ہوتے ہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ انتظامیہ غیر قانونی ہڑتال کو تسلیم نہیں کرے گی اور یونین نے جو مطالبات پیش کئے ہیں ان سے مہنگائی ختم کرانا بھی نہیں لہٰذا یونین کے چند عہدیداروں کے فعل کے نتیجے میں ملازمت کو کیوں خطرہ میں ڈالا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ کراچی جیسی بین الاقوامی ایئرپورٹ کی حفاظت کے لئے جب فوجی جوان متعین کئے گئے تو ملازمین نے اپنا فیصلہ سامنے رکھا اور ۹۰ فیصد ملازمین ڈیوٹیوں پر حاضر ہو گئے۔ پی آئی اے کی انتظامیہ نے اخبارات میں دو اشتہارات ملازمین کی بھرتی کھولنے کے سلسلے میں دیئے تو رہی سہی کسر بھی نکل گئی اور پیاسی سے تعاون کرنے والی چار فیڈریشنوں کے رہنماؤں نے پریس کانفرنس کر کے یہ اپیل کی کہ پی آئی۔ اے کے ملازمین ہڑتال ختم کر دیں کیونکہ کارپوریشن کے مینجنگ ڈائریکٹر مسٹر شاکر اللہ درانی نے یقین دلایا ہے کہ وہ ہڑتالی ملازمین کے مطالبات پر ہمدردانہ غور کریں گے۔

مذکورہ چار فیڈریشنوں میں پاکستان نیشنل فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز، نیشنل لیبر فیڈریشن، پٹرولیم فیڈریشن اور صفدر صدیقی، مضمر صدیقی کی فیڈریشن شامل تھی۔ نیشنل فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کا الحاق امریکہ کی بین الاقوامی مزدوروں کی تنظیم سے ہے۔ امریکی سامراج نے یہ جال کس لئے پھیلایا ہے اس سے شاید ہی کوئی بے خبر ہو۔ باقی نیشنل لیبر فیڈریشن جماعت کا مزدور محاذ ہے۔ دوسری دو فیڈریشنیں بھی جماعت کی بغل بچہ تنظیمیں ہیں۔

ان کا یہ بیان سراسر غلط ہے کہ پی آئی اے کے مینجنگ ڈائریکٹر نے ہڑتالی ملازمین کے مطالبات کے بارے میں کوئی یقین دہانی کرائی تھی۔ ہڑتال کے بارے میں پی آئی اے کی انتظامیہ کا ایک ہی مؤقف رہا کہ یہ ہڑتال غیر قانونی ہے، اس پر بات نہیں ہو سکتی۔ فیڈریشنوں کے رہنماؤں نے جو بیان دیا ہے وہ ان متنازعہ امور کے سلسلے میں ہے جو ہڑتال سے پہلے یونین اور انتظامیہ کے مابین زیر غور تھے اور اس بیان

میں وہ باتیں کہی گئی ہیں جو ہڑتال سے پہلے انتظامیہ نے کہی تھیں۔

چونکہ اس ہڑتال کا مقصد مزدوروں اور پی۔ آئی اے کے ملازمین کے بل بوتے پر جماعت اسلامی کو تقویت پہنچانا تھا۔ یہ ہڑتال کامیاب ہو جاتی تو جماعت اسلامی کراچی میں ادارہ ترقیات کراچی، کراچی الیکٹرک کارپوریشن اور پیٹرولیم کی صنعت میں ہڑتالیں کراتی اور امریکہ سے الحاق رکھنے والی فیڈریشن کراچی پورٹ ٹرسٹ پر بھی صورت حال پیدا کر دیتی۔ پی۔ آئی۔ اے کی ہڑتال کی ناکامی اور مزدور محاذ پر جماعت کے سب سے بڑے مورچے میں آننا پڑا انشگاف مزدوروں کے لئے خوش آئند اثرات کا متحمل ہوگا۔

اب جماعت اسلامی کو یقیناً سوچنا پڑے گا کہ وہ طلبہ کے محاذ کو کب استعمال کرے۔ اس کے لئے اس کے سامنے دو تجویزیں پیش کی جا چکی ہیں کہ تعلیمی اداروں کی یونینوں کے انتخابات میں حالات کو اپنے لئے سازگار بنایا جائے۔ انتخابات میں بائیں بازو کے طلبہ جیت گئے تو پھر دشواریاں ہوں گی لہٰذا انتخابات کے دوران ہی "ٹیمپو" بنایا جائے اور اسے اسی دوران ماچس کی تیلی تھما دی جائے دوسری تجویز یہ ہے کہ عوامی اور محنت کشوں کے محاذوں پر شکست کے بعد جماعت کو تنظیمی کام کرنا چاہیے۔

عوام دوست طاقتوں کو ہر مرحلے پر اپنا فرض پورا کرنا ہے۔ اسلامی جمعیت طلبہ اور اس قسم کی دوسری تنظیموں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔ یہ درست ہے کہ سامراجی ذہن عوام کے بھرپور تعاون کی بدولت ناکام ہو رہے ہیں۔ لیکن عوام کا تعاون صرف اور صرف عوام کے درمیان رہ کر ہی حاصل کیا جا سکتا۔ عوام سے الگ تھلگ اور انتظامیہ کے ہاتھ مضبوط کرنا دشمنوں کا مقدر بن چکا ہے۔ شکست خوردہ لوگ، انتظامیہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہیں گے جبکہ ہم دوست صرف عوام پر بھروسہ کریں گے۔

پی آئی اے ایئرپورٹ پر چاپسی کی لاش سڑ رہی ہے لیکن اسے کندھا دینے والے ابھی تک غائب ہیں۔ یہ ہاتھ انتظامیہ کا بوجھ ہلکا کرنے کی بجائے پی آئی اے کے ملازمین تو تقویت پہنچائیں تو وقت کا ایک اہم تقاضا پورا ہو جائے گا



ن - ا

ویتنامی حریت پسندوں اور کمبوڈیا کے حریت پسندوں نے ۲۱ جنوری کو کمبوڈیا کے دار الحکومت نوم پنہہ پر ایک ولولہ انگیز حملہ کر کے ہوائی اڈے کو تہس نہس کر دیا، کئی گھنٹوں کی مسلسل جنگ میں کمبوڈیا کی کٹھ پتلی حکومت کے سینکڑوں فوجی ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ حریت پسندوں نے اس حملے میں راکٹوں سے کام لیا اور چھوٹی توپوں سے گولہ باری کی جس سے گولہ بارود کے ایک بہت بڑے ذخیرے میں آگ لگ گئی اور مسلسل کئی گھنٹے تک خوفناک دھماکے ہوتے رہے۔ ایک ہزار ۹ سو نیپام بم پھٹ گئے۔ زمین لرز گئی آسمان سرخ ہو گیا۔ اور دھوئیں کے گہرے بادلوں نے پورے شہر کو اپنے لپیٹ میں لے لیا۔

اس حملے کے فوراً بعد حریت پسندوں نے نوم پنہہ سے تھوڑی دور ایک بحری اڈے پر راکٹوں سے بھرپور حملہ کیا اخباری اطلاع کے مطابق شہر کا بیشتر حصہ تباہ ہو گیا اور کٹھ پتلی حکومت کو بھاری نقصانات اٹھانے پڑے نوم پنہہ میں موجود غیر ملکی صحافیوں کے تاثرات یہ ہیں کہ ویتنامی اور کمبوڈی حریت پسند آندھی اور طوفان کی طرح نمودار ہوئے اور دیکھتے دیکھتے سامراجی حصار کو توڑ کر سرکاری فوجیوں کو آگ اور خون میں نہلا کر چلے گئے۔ واضح رہے کہ حریت پسندوں کا یہ خوفناک حملہ غیر متوقع اور اچانک نہ تھا کٹھ پتلی حکومت کے نام نہاد وزیر اعظم نون نول کو پہلے سے خبردار کر دیا گیا تھا کہ اگر اس نے جنوبی ویت نام کا دورہ کیا تو اس کا سخت انتقام لیا جائے گا۔ وزیر اعظم نون نول نے حریت پسندوں کے اس انتباہ کے باوجود جنوبی ویت نام کے سرکاری دورے پر روانہ ہو گیا۔ مگر جب وہ سامراج کی دلالی کا حق ادا کرنے کے بعد کمبوڈیا پہنچا تو اسے اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی حریت پسندوں نے اپنے اس حملے سے ثابت کر دیا

# نوم پنہہ سامراج کے لئے دوسرا ڈین بن پھو بنتا جا رہا ہے

کہ سامراج اور اس کی ایجنٹ حکومتیں واقعی کاغذی شیر ہیں، امریکی سامراج کو جب تک آزمایا نہ جائے وہ اپنے سازو سامان، کثرت اسلحہ اور وسائل سے ذاتی اصلی نے وڈا شیر" معلوم ہوتا ہے، مگر آزمانے



پرنس سہانوک

کے بعد اندر سے وہ گیدڑ نکلتا ہے جو شیر کی کھال اوڑھ کر جنگل کے دوسرے جانوروں کو ڈراتا دھمکاتا پھرتا تھا۔

ویت نام کے عظیم رہنما ہوچی منہہ نے صحیح کہا تھا کہ "جنوب مشرقی ایشیا سامراج کا قبرستان ثابت ہوگا" چین کے عظیم قائد ماوزے تنگ کا یہ ارشاد کہ سامراج ہر جگہ زوال پذیر ہے، اس کے اثرات مٹتے جا رہے ہیں، جگہ جگہ اس پر ضرب لگاؤ" اور اتنا لگاؤ کہ بالآخر سامراج اپنی تمام فتنہ انگیزیوں سمیت قبر میں اتر جائے"

کمبوڈی اور ویتنامی حریت پسندوں کا تازہ حملہ ویت نام، لاؤس، کمبوڈیا، کی مسلسل تابڑ توڑ اور ولولہ انگیز حملوں کی ایک کڑی ہے، "نوم پنہہ سامراج کا دوسرا ڈین بن پھو بنتا جا رہا ہے۔



# اعلانِ تاشقند

## جذبۂ حریت کی نفی ہے



پروفیسر عتیق احمد

ایک مقامی ہفت روزہ کے ایک گذشتہ شمارے میں " اعلانِ تاشقند کی سالگرہ " کے عنوان سے ایک جائزہ چھپا ہے۔ اس جائزے کا نفسِ مضمون اعلانِ تاشقند پر نکتہ چینی کرنے والے افراد اور سیاسی پارٹیوں کے مؤقف، ان کے استدلال اور ان کی "سیاسی ذہنیتوں" پر کچھ احکامات اور کچھ فیصلے صادر کرنے پر مشتمل ہے۔ چونکہ اس ہفت روزہ کے ادارۂ تحریر نے اس سیاسی جائزے کو بغیر ادارتی نوٹ کے شائع کیا ہے اس لئے صحافتی ضابطۂ اخلاق کے تحت یہ بات طے ہے کہ ادارہ نے اس مضمون کے نفسِ مدّعا کو بہ کمال و تمام اپنی ذمہ داری بنالیا ہے۔ چنانچہ آئندہ سطور میں ہمارا تخاطب مدیرانِ گرامی قدر اور ان کے سیاسی مربیوں سے ہوگا۔

اس سے پیشتر کہ مذکورہ جائزے کے مندرجات پر نظر ڈالی جائے، بہتر یہ ہے کہ اعلانِ تاشقند کی وجہِ جواز پر ایک سرسری نظر ڈال لیں۔ اعلانِ تاشقند کے پسِ منظر میں ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ ہے۔ اس جنگ کی نوعیت یہ تھی کہ ہندوستان نے ۱۹۶۵ء میں مقبوضہ کشمیر میں جدوجہدِ آزادی کی اٹھنے والی لہریں پاکستان کو ملوث کیا۔ اور بغیر کسی واضح ثبوت کے پاکستان کو کشمیر پر حملہ آور گردان کر ۵ ستمبر کی رات کو لاہور۔ گجرات سیکٹر کے طویل محاذ پر لشکر کشی فرمادی۔ آگ اور خون کا یہ کھیل سترہ دنوں تک کھیلا گیا اس دوران میں یورپ کی متعفن بی جمالو یعنی اقوامِ متحدہ اور اس کے خاص الخاص مربیانِ اعلیٰ مرتبت "ضابطہ کی کارروائیوں" پر غور و خوض فرماتے رہے۔ خدا خدا کر کے کہیں ۲۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کو سلامتی کونسل نے ایک تفصیلی قرارداد برائے جنگ بندی کا اعلان فرمایا اور دونوں ملکوں کو بزرگانہ نصیحت فرمائی کہ اچھے بچے لڑا نہیں کرتے۔ لہٰذا بس اب لڑائی بھڑائی بند کردو اور گلے مل جاؤ۔ اور اس طرح سے یہ سترہ روزہ جنگ اختتام پذیر ہوئی۔ دسمبر ۱۹۶۵ء میں امریکی صدر کی دعوت پر اس وقت کے صدرِ پاکستان امریکہ گئے۔ (ہندوستان نے اس دعوت کو رد کر دیا تھا) امریکہ میں صدرِ پاکستان اور صدرِ امریکہ کی ملاقات کے بعد جو مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا تھا اس سے بھی پاک بھارت جنگ کی صورتِ حال میں جنگ بندی سے آگے کوئی کوئی قدم نہ بڑھ سکا۔ وجہ صاف ظاہر تھی، کہ یہ ملاقات یک طرفہ تھی۔ اور امریکی سامراج کے اپنے مفادات آڑے آتے تھے۔ دوسری طرف بھارت اس میں شریک ہی نہ تھا۔ بالآخر جنوری ۱۹۶۶ء میں پاکستان اور بھارت روس کی دعوت پر بمقام تاشقند ایک ہی منبر پر بٹھا دیئے گئے اور اس طرح سے ۱۰ جنوری کو اعلانِ تاشقند عمل میں آیا۔

مذکورہ جائزہ میں اعلانِ تاشقند کا متن بھی دیا گیا ہے۔ اس پورے متن میں پاک بھارت کی ستمبر والی جنگ کا اصل پسِ منظر یعنی مسئلۂ کشمیر کے حل کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ پورے اعلانِ تاشقند کو پڑھ جائیے تو یوں محسوس ہوگا کہ گویا دو ممالک کے درمیان کوئی بلاوجہ معمولی سی رنجش تھی، اور اس رنجش کو آپس کے خیرسگالی جذبات کے اظہار سے، سفارتی تعلقات کے پھر سے جڑ جانے سے اور اعلیٰ سطح اور دوسری سطحوں پر میٹنگوں کا سلسلہ جاری رکھنے پر اتفاق کرنے سے دور کیا جاسکتا ہے۔ خود اسی مذکورہ جائزہ میں ہی ستمبر ۶۵ء کی جنگ کے اسباب اور عوامل کو زیرِ بحث نہیں لایا گیا ہے، اور نہ اس کی اہمیت کو اس کے تاریخی پسِ منظر میں دیکھنے یا دکھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ جائزہ اس اعتبار سے اعلانِ تاشقند کی "روح" اور جذبہ کا مکمل عکس ہے، اور چونکہ اعلانِ تاشقند پاک بھارت کی ۶۵ء کی جنگ کی وجوہات کو اہمیت نہیں دیتا اس لئے اس کے مفسّرین اور وکلاء پر بھی سکوت لازم آتا ہے۔ ہاں امن کی نفیری دونوں جگہوں پر ایک ہی سُر لَے میں بجتی سنائی دے گی۔ مگر امن برائے چہ؟ جب جنگ کی وجوہات (یعنی قضیۂ کشمیر) آپ کے لئے وجود ہی نہیں رکھتی تو تلقینِ امن اور ہدایت نامۂ خیرسگالی کیوں؟ اور کس لئے؟؟

بات دراصل یہ ہے کہ بس یہی بات بنیادِ فساد ہے۔ اعلانِ تاشقند کی برسیاں منانے والے مخلصوں اور اس اعلان کی مخالفت کرنیوالوں کے درمیان۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ مت دیکھو کہ امن کیوں چاہیئے؟ بس یہ دیکھو کہ امن چاہیئے آشتی چاہیئے۔ صلح صفائی چاہیئے۔ اعلانِ تاشقند پڑھو اور جان بناؤ۔ رہا کشمیر کا مسئلہ تو حضرت کو سنگین چونکہ اس پر خاموشی پسند فرماتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسا کہ حضرتِ امریکہ بھی پسند فرماتے ہیں۔ لہٰذا تم اے پاکستانی ناہنجارو! اعلانِ تاشقند کی مخالفت کرنے والو! ہم سب سمجھتے ہیں کہ تم چاہے لاکھ پیپلز پارٹی میں ہو، مگر تم سب ہو جماعتِ اسلامی کے آدمی اس لئے کہ تم ایک سوشلسٹ ملک کے جذبۂ خیرسگالی کو ہدفِ تنقید بناتے ہو۔ اور ہم خواہ وہی کہیں جو حضرتِ امریکہ فرماتے ہیں لیکن ہمیں سچا مارکسسٹ جانو۔ اور ہم سچ کہتے ہیں کہ تم سب چینیوں کے ورغلائے ہوئے ہو۔ اس لئے کہ چین والے بھی کشمیر کے تنازعہ کا ذکر بار بار کرتے ہیں اور تم بھی وہی رٹ لگائے ہوئے ہو۔

# اعلانِ تاشقند کی سالگرہ منانے والوں کو روس کی ناراضگی گوارہ نہیں

قارئین کرام۔ اس منطق کا ہمارے پاس کیا جواب ہے؟ کہ اعلانِ تاشقند کا مخالف تو جماعتِ اسلامی کا آدمی ٹھہرا اور کشمیر کے لاکھوں عوام کے حق خود آزادی کو پسِ پشت ڈال کر امن، صلح و آشتی اور ثقافتی اور تجارتی تعلقات کا درس دینے والے سچے اور اصلی ترقی پسند ٹھہرتے ہیں۔ ایک بہت ہی اہمیت کا سوال یہ ہے کہ اعلانِ تاشقند میں بالراست کشمیریوں کے حقِ خود آزادی کا ذکر کیوں نہیں ہے؟ اور اس سیدھے سوال کا جواب بھی بہت سیدھا ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کی ناراضگی نہ جناب کوسیگن کی پسند خاطر ہے۔ اور نہ ہی چچا سام کی آل اولاد کو۔ اور چنانچہ نہ ہی اعلانِ تاشقند کی سالگرہ منانے والوں کو رہا پاکستان کا مسئلہ تو یہ بیچارا اتنا چھوٹا ملک اور اتنا غریب اور شریف ملک ہے کہ اس پر غریب کی "جورو سب کی بھابی" والی مثل صادق آتی ہے اور کشمیر چونکہ ہندوستان کے حکمرانوں کا اٹوٹ انگ ہے لہٰذا پاکستان خوش ہو یا ناخوش، یاروں کا پرنالہ اس شریف ملک ہی کے آنگن ہو کر بہے گا۔

اگر صورتِ حال یہ نہ ہوتی تو بنیادی بات یہ ہے کہ وہ خواہ اعلانِ تاشقند ہو یا اعلانِ واشنگٹن جنگِ ستمبر کے محرکات اور اس کے پسِ منظری عوامل پر پہلے گفتگو ہونی چاہیئے اور اس وجہ نزاع کا کھلا تذکرہ ہونا چاہیئے جو اس جنگ کا اصل سبب ہے۔ سوال یہ بھی ہے کہ آخر ہندوستان اور پاکستان بھی ایسے ہی پڑوسی ہیں جیسے کہ ایران اور پاکستان۔ ان ۲۳ سالوں میں ایران اور پاکستان کی کتنی جنگیں ہوئی ہیں؟ کتنے تنازعات امریکہ یا روس یا اقوامِ متحدہ یا برطانیہ نے چکائے ہیں؟ اس کے برعکس ہمارے اور ہندوستان کے تعلقات ان ۲۳ برسوں میں کتنے دن خوشگوار بلکہ محض معمول پر رہے ہیں۔؟

پاکستان، ہندوستان کے مقابلے میں بہت چھوٹا ملک اور صنعتی، تجارتی اور پیداواری اعتبار سے ایک بہت پسماندہ اکائی کے طور پر ابھرا تھا۔ ان دنوں ہندوستان کی قیادت بھی تاریخ سیاسیاتِ عالم کے ایک بطلِ جلیل یعنی پنڈت نہرو آنجہانی کے ہاتھوں میں تھی جن کے تدبر اور ترقی پسند کردار کے متعلق دو متضاد رائیں نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن ہوا کیا؟ یہی کچھ کہ جوناگڑھ مسلم حکمران کی اسٹیٹ تھی مگر غیر مسلم آبادی کا تناسب اس ہندوستان میں ادغام کے کیس کو مضبوط کر دیتا ہے کشمیر ایک ہندو حکمران کی اسٹیٹ تھی پھر بھی مسلم آبادی کی اکثریت اس ادغام کو ہندوستان کا بنا دیتی ہے۔ یہاں بنیادی سوال ہندو یا مسلمان اسٹیٹ کا نہیں ہے۔ اور آپ چاہیں تو اسے ہندو مسلم تنازعے کا نام بھی نہ دیں صرف یہ اصول مان لیجیے کہ اکثریت کو اس فارمولے کے تحت اپنی قسمت کے فیصلے کا اختیار دیا گیا تھا جو برصغیر ہندوستان کی تقسیم کے ایک باقاعدہ معاہدہ کی باضابطہ شق مان لیا گیا تھا۔ اب

**ایسے معاہدوں کی سالگرہ منانا اُن کو مبارک رہے جو جارح طاقتوں سے "بقائے باہمی" کے عہد و پیمان کرتے ہیں**

اگر دنیا کی کوئی طاقت بھی اہل کشمیر کے اس حقِ خود آزادی کے مسئلہ کو پسِ پشت ڈال کر چور دروازوں والے امن کی بات کرتی ہے اور پاکستان پر جارحانہ اقدام کی صلح و آشتی کے نام پر ہمت افزائی کرتی ہے تو ایسے معاہدوں کی سالگرہ منانا ان کو مبارک اور مسنون رہے جو اپنے وجود کو محض اپنا وجود مان کر جارح طاقتوں سے "بقائے باہمی" کے عہد و پیمان کرتے ہیں اپنے پڑوس میں لاکھوں افراد کے حقِ خود آزادی کی جنگ میں اعانت کو پیپلز پارٹی کو جماعت اسلامی اور ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ وغیرہ وغیرہ کے جذبۂ تعصب اور عناد سے ڈانڈے ملاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ جناب فیض احمد فیض، سید سبط حسن، جناب عبدالولی خان اور جناب محمود الحق عثمانی کے ہاتھ چوموں اور ان کی پیشانیوں کو بوسہ دوں کہ جن کی دانشورانہ سربراہی اور سیاسی لیڈرشپ میں ہمارے یہاں ایسے ایسے منطقیانِ اجل اور فاضلانِ ادب و آگہی پرورش پا رہے ہیں کہ اگر ان کا دم سلامت رہا تو کسی نہ کسی دن روس کی ترقی پسند قیادت امریکہ اور ویت کانگ کو بھی ایک اور ایسا ہی "اعلانِ تاشقند" عطا فرما دے گی جیسا کہ پاکستان اور اہلیانِ پاکستان کو دیا گیا ہے۔ اور اس اعلان کی "روح" اور اس کا "جذبہ" اس کے سوا اور کیا ہے کہ پاکستانی عوام کے سروں پر سے سترہ دن جو قیامت جناب شاستری آنجہانی کے بے مثال سیاسی تدبیر اور ان کے "جذبۂ امن پرستی" کے ہاتھوں گزری تھی وہ دراصل عیدِ قربان تھی کہ جس میں ثواب پر پھر کے "ذبح" کرنے والے ہی کو پہنچتا ہے اور وہ جو "ذبح" ہو گیا سو وہ تو اس فلسفۂ قربانی کے تحت از خود ہی امر ہو گیا۔

اور اب چلتے چلتے اس سادگی کو بھی ایک نظر دیکھ ہی لیجیے کہ جو اس جائزہ نگار اور ادارۂ تحریر کو یہ نہیں سمجھنے دے رہی ہے کہ ہندوستان میں اعلانِ تاشقند کی مخالفت ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ قسم کی پارٹیاں کیوں کرتی ہیں؟ اے تازہ واردانِ بساطِ عقل و دانش! یہ بھی سوچو کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ پر شاستری آنجہانی جیسے "بیند" اور "مضبوط عزم و حوصلے" والے وزیراعظم کو اکسانے اور مجبور کرنے والی کون سی طاقت تھی؟ اور یہ طاقت نہرو جیسے وزیراعظم پر اس درجہ کیوں غالب نہیں آسکی تھی؟ شاستری صاحب کی وزارتِ عظمیٰ اور ہمارے دور میں ابھی ایک دہائی کا عرصہ بھی حائل نہیں ہوا ہے۔ سارے واقعات تازہ ہیں۔ شاستری کیبنٹ پر نظر ڈالیئے اور اس کیبنٹ کی پشت پر تار ہلانے والے عناصر پر نگاہیں جمایئے اور پھر ۶۵ء میں ہند کے "پورس کے ہاتھیوں" کا حشر دیکھئے اور پھر جن سنگھ اور ہندو مہاسبھا سے سمجھوتا دل

باقی صفحہ ۳۸ پر

## میر خلیل الرحمٰن کو پی۔ آئی۔ اے انتظامیہ کی انتقامی کارروائیوں سے اپنے انتقامی کارنامے یاد آگئے

ترکی بہ ترکی

# جب سیاسی لیڈروں نے ہڑتال ختم کروانے کی بھیک مانگی

درویش

اُردو کے کثیرالاشاعت اور رقی الحال مودودی جماعت کے مقبوضہ اخبار کا جمعہ ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء کا اداریہ "پی آئی اے کے لئے نیا مرحلہ" درویش کے سامنے ہے۔ اس کے چند چیدہ چیدہ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"اب ضرورت اس بات کی ہے کہ باہمی مذاکرات کے آغاز سے پہلے دونوں فریقوں کی جانب سے کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جو فضاء کو پھر مکدر کرنے کا سبب بنے خاص طور پر انتظامیہ ہڑتال پر جانے والے تمام ملازمین کو کام پر واپس لینے میں کوئی تامل نہ کرے، یہ بات مذاکرات کے لئے ایک اچھی فضاء بھی مہیا کرے گی، یونین اور انتظامیہ کے تعلقات کو بہتر بنانے کا بھی سبب بنے گی۔"

الحمدللہ، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میر خلیل الرحمان اور ان کے اداریہ نویس کو انتظامیہ اور یونین کے مابین بہتر تعلقات کا خیال آگیا۔ وقت وقت کی بات ہے اپریل ۱۹۷۰ء اور جنوری ۱۹۷۱ء میں یوں تو زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ مگر ایک الیکشن بیچ میں پڑتا ہے۔ الیکشن بھی ایسا جس میں مزدور دشمن قوتیں ہار گئیں اور مزدور دوست طاقتیں جیت گئیں۔ اس الیکشن نے پی آئی اے کی انتظامیہ کو مزدور دشمن مزدور لیڈروں کو کچلنے کا خیال دلایا اور "جنگ" جیسے مزدور دشمن اخبار اس قسم کا لہجہ اختیار کرنے لگے۔

آخر میں اداریہ نویس نصیحت فرماتے ہیں:۔

"آخر میں ہم پی آئی اے کی انتظامیہ کو ان خبروں کی طرف متوجہ کرنا ضروری خیال سمجھتے ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض ملازمین کو کام پر واپس نہیں لیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں ایسا بعض غلط فہمیوں کی بنا پر ہوا ہوگا۔ اور اس کی ذمہ داری ماتحت عملے تک محدود ہوگی۔ توقع ہے کہ انتظامیہ واضح طور پر یہ ہدایت جاری کر دے گی کہ کسی شخص کو واپس آنے سے نہ روکا جائے۔"

درویش کے خیال میں یہ پیرا غلطی سے چھپ گیا ہے۔ ممکن ہے کسی آئندہ اشاعت میں اس کی تصحیح چھپے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ "جنگ" میں یہ بات چھپ جائے، یہ ضرور کوئی سازش ہے، کیا یہ جملے لکھنے والا میر خلیل الرحمان کو اپریل ۱۹۷۰ء کا آخری ہفتہ یاد دلانا چاہتا ہے جب پی ایف یو جے نے ہڑتال ختم کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ ہڑتالی کارکن اپنے کام پر واپس جانے کے لئے اپنے دفتروں میں پہنچے تو باقی تمام اخبارات نے تو اپنے عملے کا خیر مقدم کیا تھا اور کام پر واپس لے لیا تھا لیکن خلیل الرحمٰن جوان دنوں "گالی گفتار" کا پیشہ بھی کرنے لگے تھے، نے اپنے شیش محل پر اپنے بھائی کو پہریدار بنا کر کھڑا کر دیا تھا۔

پی آئی اے والے تو آدمیوں کو واپس لینے کے لئے "متعلقہ اتھارٹی" کی منظوری کا لفظ استعمال کر رہے ہیں، لیکن میر خلیل الرحمٰن کے ہاں منظوری مودودی جماعت کے تنخواہ دار اور جنگ کے ایک ملازم دے رہے تھے۔ ان کو اشارہ ایک انٹلی جینس افسر کی طرف سے مل رہا تھا۔ اور ساتھ شرط یہ تھی کہ جو صاحب اپنی یونین سے استعفا دے دیں وہ ہمارے ہاں کام کر سکتے ہیں۔ یہ کیا ہوا کہ تنخواہ تو میر خلیل الرحمٰن دے اور بات چلے منہاج برنا کی۔ پی آئی اے کی انتظامیہ نے تو ایسی شرط بھی نہیں لگائی۔

یہ اداریہ نویس نہ جانے ہمارے میر صاحب کو کیوں گئے دنوں کی یاد دلا کے تکلیف دے رہا ہے۔ وہ تو بیچارے پہلے ہی ایک ایسے مرض کا شکار ہیں کہ ان کا ہاتھ ہمیشہ کیلئے پھڑ رہتا ہے۔ اس اداریئے میں توقع ظاہر کی گئی کہ "انتظامیہ واضح طور پر یہ ہدایت جاری کر دے گی کہ کسی شخص کو واپس آنے سے نہ روکا جائے۔" یہ توقع کیسے پوری ہو سکتی ہے آج کا اخبار پڑھ کر تو میر صاحب کو خلش ہونے لگی ہوگی۔ انہیں اپنی ہدایات یاد آنے لگی ہوں گی۔ اور اپنے بھائی کے یہ کارنامے یاد آئے ہوں گے کہ وہ اپنے شغل "مئے و مینا" کے ربط سے کئی نام نہاد لیفٹسٹوں کو بھی توڑ کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ لیفٹسٹ آج کل سنا ہے کہ پھر "ترقی پسند" کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ اور پیپلز پارٹی کی کامیابی کی مبارکبادیں وصول کرتے ہیں۔

# جنگ سے تو اپنی جنگ رہے گی

ملازمین کو کام پر واپس نہ لینے اور انتقامی کارروائیوں کے ذکر سے بے چارے میر خلیل الرحمٰن کو اپریل ۱۹۷۰ء کے وہ لمحے یاد آرہے ہیں جب ابراہیم جلیس، افضل صدیقی، ظفر رضوی، عبدالحمید چھاپرا، محمود شام، سید وجاہت علی اور وہ لوگ جو بعد میں جنگ میں چلے گئے۔ حفیظ صدیقی، یونس ریاض، حامد سعیدی، منیر احمد اور خوشنویس حضرات حفیظ صاحب، التصویب الحسنی اور ان کے دوسرے ساتھی گیٹ پر کھڑے تھے۔ انہیں وہ سیڑھیاں چڑھنے سے بھی منع کردیا گیا تھا جو ان کے خون پسینے پر تعمیر کی گئی تھیں۔ لیبر ڈیپارٹمنٹ بھی کچھ نہ کرسکا۔ وہ حضرات بھی میر صاحب سے تعلقات خراب ہوجانے اور کالم بند ہوجانے کے خوف سے اپنے ترقی پسند ساتھیوں کے لئے بات کرنے کو تیار نہ ہوتے جنہیں ایک عرصے سے ترقی پسندی کا دعویٰ ہے۔ اس ایک اداریئے نے میر صاحب کو کیا کچھ یاد دلایا ہے اور میر صاحب کا ہاتھ بار بار کلیجے کی طرف بڑھ رہا ہے درویش بھی اب اس صدمے کو زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے اب کسی اور طرف رخ پلٹتا ہے۔ باقی پھر کبھی۔ کیونکہ "جنگ سے تو اپنی جنگ رہے گی"

کا پیش کیا۔"

یہ خط جو تمام اخبارات میں چھپ چکا ہے، پیاسی کے ٹریڈ یونین ازم کا علمبردار ہے۔ اس خط میں ایسا "بھیک منگوں" والا لہجہ ہے۔ کہ آدمی تو آپ نے اصولاً ٹھیک نکالے ہیں۔ لیکن مائی باپ ہماری "ٹوہر" (اکرڈ فون) کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ (اصل الفاظ یہ ہیں، اس سے پیاسی کے وقار کو صدمہ پہنچے گا۔) دنیا والے کیا کہیں گے کہ پیاسی اور پی آئی اے کی انتظامیہ میں چل پڑی ہے۔ پیاسی کے پی آئی اے کی انتظامیہ سے گہرے تعلقات کے دعوے غلط ہیں۔ پیاسی اور پی آئی اے کی انتظامیہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ خدا کے لئے ایسا نہ کیجئے۔ ہم تو سدا سے آپ کے غلام ہیں، یہ بھرم تو رہنے دیجئے (اصل الفاظ یہ ہیں :۔ یونین اور انتظامیہ کے تعلقات پہ زد پڑے گی جو ہمیشہ بہتر رہے ہیں)۔

پی آئی اے کی انتظامیہ نے بھی خوب مزے لئے کر ان لوگوں کو واپس تو کیا لیتی۔ یہ خط چھپوا کر شہر میں تقسیم کردیا۔ جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا۔ پیاسی والے کہتے پھر رہے ہیں گڑ ہیں جانتی پیار کیسے دکھ ہو۔ لگر ڈھنڈورا پیٹتی پیار کرے نہ کو —

جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ کہاں پی ایف یو جے، کہاں پیاسی۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ پی ایف یو جے نے مطالبات منظور کروالئے، لوگوں کو عبوری امداد دلوائی۔ اس کے لیڈروں نے اپنی ملازمتوں کی قربانیاں دیں، لیکن اپنے موقف سے نہ ہٹے۔ یہاں تو ہڑتال پیاسی کے لئے کمبل بن گئی تھی۔ کبھی جمعیت علمائے پاکستان کو بیچ میں ڈالا، کبھی لیبر فیڈریشن کو۔ کہ بھائیو کسی طرح صلح کرادو۔ ہمارے باپ کی بھی توبہ آئندہ ہڑتال نہیں کریں گے۔ کس مصیبت میں پھنسا دیا، اس مجید صابر شیخ نے۔ ہمارا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ بغیر مطالبات کے ہی ہڑتال ختم کروا دو ہم واپس آنے کو تیار ہیں۔ فل والیوم کے نعرے لگانے والے اس روز بڑی خاموشی سے بارش میں بھیگ رہے تھے۔ جب کام پر جانے سے پہلے ان کی چیکنگ کی جارہی تھی اور بعض کو کام پر واپس لینے سے انکار کیا جارہا تھا، اس وقت ساری "اسلام پسندی" دھری رہ گئی۔ یہ لیڈری بڑی بری لت ہے۔

---

"پیاسی" کی ہڑتال ختم ہوگئی۔ پیاسی نے اپنی شاندار فتح پر ایک جلوس بھی نکالا۔ جو حافظ محمد اقبال کی قیادت میں بلکہ کندھوں پر ان کا بوجھ اٹھا کر نکالا گیا۔ اس "فتح" کے اعداد و شمار یہ ہیں کہ کوئی مطالبہ منظور نہیں ہوا۔ کوئی گرفتار شدہ بغیر ضمانت کے رہا نہیں ہوا۔ تمام ملازمین کو کام پر واپس نہیں لیا گیا۔ اس کے باوجود پیاسی نے شاندار کامیابی حاصل کی، اور یہ جلوس نکالا۔

اس پر ایک صاحب کہنے لگے کہ یہ ہڑتال بھی پی ایف یو جے کی طرح فلاپ رہی۔ ہمارے ایک دوست نے جواب دیا کہ "یہ تو بالکل غلط ہے۔ پی۔ ایف۔ یو۔ جے کے مطالبات منظور ہوگئے تھے، البتہ بعض لوگوں کو قربانی ضرور دینا پڑی۔ لیکن پی ایف یو جے اور پیاسی کی ہڑتال میں یہ فرق ضرور ہے کہ پی ایف یو جے کا ایسا کوئی خط برآمد نہ ہوسکا، جیسا پی آئی اے کی انتظامیہ نے پیاسی کے صدر

# کوسیگن ویت نام کو بھی "اعلانِ تاشقند" عطا کریں گے؟

صفحہ ۳۶ سے آگے

تک کسی بھی اعلان تاشقند سے ناراضگی کو دیکھئے اور متعصب ذہنیت کے جذبۂ اقتدار CHARVINISM کی آگ پر اوس پڑتا دیکھئے تب ہندوستان کی مذہبی جنونی قوتوں کے اس احتجاج کی بات سمجھ میں آئے گی اور ہم جس بات کو روتے ہیں وہ یہی ہے کہ روس کی ایسی ترقی پسند طاقت نے کشمیریوں کے حق خود آزادی کی جنگ کا اعلانِ تاشقند میں کھلا ذکر نہ کرکے ایک تو ہندوستان کے اس ہی مذہبی جنونی قوت کی پشت پناہی کی ہے جس نے آج تک کشمیریوں کی راہِ آزادی کو روکے رکھا ہے اور دوسری طرف پاکستان ایسے ملک کے ۱۲ کروڑ عوام کے جذبۂ حریت پسندی کی تذلیل کی ہے جو خود بیشمار اقتصادی اور معاشی استحصال پسندوں کے پھندوں میں جکڑے ہوئے ہیں لیکن کشمیر، فلسطین، ویت نام اور دنیا کی ہر اُس قوم کے حق خود اختیاری کی جنگ کو اخلاقی سہارا دے رہے ہیں جو مذہبی تعصب یا جذبۂ وسعت پسندی EXPANSIONISM کی ہوس کا شکار ہیں۔ اعلانِ تاشقند اس ہی جذبۂ حریت کی نفی کرتا ہے اور ہم چونکہ اس ہی جذبۂ آزادی کے حق کے لئے لڑ رہے ہیں اس لئے اے "جذبۂ تاشقند" کی برسیاں منانے والوں! جب تک تم بھی اس جذبۂ حریت و آزادی کے قائل ہوکر ہمارے ہم قدم نہیں بن جاتے ہو ہم تمہیں اس "جذبۂ تاشقند" کی یاد دلاتے رہیں گے۔ جو مظلوم کشمیریوں کے حق خود آزادی کو امن اور آشتی کی گل قند میں ملاکر مذہبی جنون زدوں کو ہڑپ کرانے کی ترکیب سمجھاتا ہے۔

## جمعیت "طلبہ" کو کامیاب کرانے کے لئے وی سی کا اعلان

# "جامعہ تشریف نہ لائیے" ترقی پسندوں کے لئے داخلے بند ہیں

**وہاب صدیقی**

مودودیت، دسمبر کے بعد سکڑتے سکڑتے جامعہ کراچی تک محدود ہو گئی ہے۔ عام انتخابات میں عوام نے اسے ناک آوٹ کیا تو پی۔ آئی۔ اے میں بیاسی سے ہڑتال کروا کر اس نے اپنے وجود کا احساس دلانے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن جامعہ کراچی کے موشے دایان نے ابھی تک نوشتہ دیوار نہیں پڑھا۔ وہ ابھی تک اچھڑکے وفادار ہیں۔ اور جامعہ کراچی کو مودودیت کا قلعہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ڈاکٹر آئی۔ ایچ۔ قریشی اسلامی جمعیت طلبہ کو انجمن اتحاد طلبہ جامعہ کراچی پر مسلط کر کے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ مودودیت کا بقا ان کے دم سے ہے، اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنا پرانا طریقہ اپنایا ہے۔ این۔ ایس ایف کے لیڈروں اور سرگرم کارکنوں، سید حسنین حیدر بخاری، خواجہ شریف، نایاب احمد اور ہلال احمد وغیرہ پر جامعہ کے دروازے بند کر دیئے ہیں تا کہ اسلامی جمعیت طلبہ کی جیت کا راستہ ہموار کیا جا سکے۔ یہی حربہ انہوں نے پہلے بھی استعمال کیا تھا۔ این۔ ایس۔ ایف کے سابق صدر معراج محمد خاں کو داخلہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور حسین نقی کو نکال دیا تھا۔

جامعہ کراچی کے سام پسند وائس چانسلر کے اس "قومی جرم" میں جامعہ کے رجسٹرار سید محمد نجم الدین برابر کے شریک ہیں بظاہر یہ حضرت بہت سیدھے سادھے اور شریف لگتے ہیں اور گمنامی کے پردے میں پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن جو لوگ جامعہ کراچی کے حالات پہ گہری نظر رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ڈاکٹر آئی ایچ قریشی اور سید محمد نجم الدین "بھائیاں دی جوڑی" ہے یہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اور ایک دوسرے کی بدعنوانیوں کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔

نجم الدین آمریت پرست ہیں۔ ایوب خاں جیسے قوم ایک غاصب اور لیٹرا سمجھتی ہے۔ جو جمہوریت اور حسن ناصر جیسے مزدور کسان رہنما کا قائل ہے، وہی ایوب نجم الدین کا آئیڈیل ہے۔ یہ حضرت ایوب خاں کی مداح سرائی اور قصیدہ گوئی میں اتنے آگے بڑھے کہ انہوں نے "ہمارا مستقبل۔ بنیادی جمہوریت" کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھ مارا اور خیر سے یہ حضرت شاعر بھی ہیں چنانچہ "میر کارواں" کے عنوان سے ایک نظم بھی اس کتابچے میں ہے۔ جس میں ایوب خاں کی شان میں آسمان

ہمارا مستقبل

بنیادی جمہوریت

سید محمد نجم الدین، ڈپٹی رجسٹرار، کراچی یونیورسٹی

سام پسند وی سی کے دستِ راست ایوب کے مداح نجم الدین کی کتاب کا سرورق

سے قلابے ملا دیئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

وطن کی آج قسمت جاگ اٹھی ہے
کہ صدرِ مملکت ایوب خاں ہیں!!
امیدیں جن سے بر آئیں ہماری
وہی ایوب میر کارواں ہیں!

اس کتابچے میں موصوف نے ایوب خان کو قوم کا نجات دہندہ اور قائد اعظم ثانی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

"اکتوبر ۱۹۵۸ء کی ایک یادگار رات کو وطن کے ایک مجاہد نے جس کو خدا نے قائد اعظم کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت عطا کی تھی۔ وطن کی آبرو سے کھیلنے والے ان مفاد پرست لیڈروں کے من مانے اقتدار کو ختم کر دیا اور پاکستان کی سرزمین اور پاکستانیوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیبت ناک اندھیرے کو چیر کر فضا میں اجالے کی کرن ہرا دی۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ؏

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر

جنرل ایوب پاکستان کے آٹھ کروڑ عوام کے خاموش نالوں کا جواب بنکر اپنے ہم وطنوں کے سامنے آئے۔"

اس کتابچے کو انہوں نے مفت تقسیم کرایا اور اس کے صلے میں دربار ایوبی سے ترقی پائی اور ڈپٹی رجسٹرار سے کرسی رجسٹرار تک رسائی ہوئی۔ ان کی بدعنوانیوں اور اقربا پروری کی فہرست تو بہت طویل ہے۔ صرف ایک مثال سے ہی ان کی اقربا پروری نمایاں ہو جاتی ہے، ان کے بچوں کا ایک ٹیوٹر پر ان نظر کرم ہو گئی۔ اسے شعبہ نباتیات جامعہ کراچی میں بحیثیت DEMONSTRATOR ملازم کروا دیا۔ کچھ ہی عرصے بعد اسے لیکچرار کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اور پھر فوراً تعلیمی وظیفہ دے کر بیرون ملک بھیج دیا۔ واپسی پر بہت سے سینئر اساتذہ کو نظر انداز اسے ریڈر بنا دیا گیا۔ جامعہ کراچی کا یہ قانون ہے کہ کوئی استاد پانچ سال سے پہلے دوبارہ بیرون ملک نہیں جا سکتا۔ لیکن رجسٹرار نے ان صاحب کو پانچ سال کے عرصے میں دو

باقی صفحہ ۴۲ پر

# حقہ ٹوپی والے گول میز کے نیچے دب گئے

لاہور ——— سہراب اسلم

لاہور ع ۳ سے "حقہ ٹوپی ٹھا" ہوگیا ہے۔ اور نیپ (ولی خاں) کے سابق صدر مغربی پاکستان اور آج کل پاکستان پیپلز پارٹی کے وائس چیئرمین میاں محمود علی قصوری قومی اسمبلی کے لئے منتخب ہو گئے ہیں۔ اب جبکہ انتخابی محاذ پر ترقی پسند قوتوں کے مخالف ایک ایک کرکے "مارے" جا چکے ہیں۔ تو جی چاہتا ہے کہ کچھ باتیں وہ بھی ہو جائیں جو کبھی بہت اہم تھیں مگر آج وقت کی تہوں میں دب کر رہ گئی ہیں۔ پچھلی باتوں کو دہرانے کا ایک فائدہ ہے وہ یہ کہ "مستقبل کا چہرہ" اس آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

خواجہ رفیق لاہور کے پرانے ورکر ہیں۔ لیڈر اس لئے نہیں کہ جب کبھی حالات نے ان کے سپرد یہ کام کرنا چاہا تو یہ اپنی کج فہمی کی بناء پر پیچھے ہٹ گئے یا ہٹا دیئے گئے تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ تحریک جمہوریت کے شباب (مارشل لاء ۱۹۶۹ء سے ذرا پہلے) میں جن لوگوں نے عبوری حکومت کی وزارت کے لئے اچکن سلوائی تھیں ان میں پی ڈی پی کے خواجہ رفیق بھی شامل تھے۔ حمزہ اس گروہ کے لیڈر تھے۔ اپنی دانست میں یہ لوگ پاکستان کی مستقبل کی سیاہ و سفید کے مالک بننے والے تھے۔ پان منڈی کی بغل میں واقع خواجہ کے پرنٹنگ پریس میں ان دنوں خاصی رونق رہنے لگی تھی۔ ان سے ذرا نچلے درجے کے ورکر لوگ "ایڈوانس مبارک باد" اٹھائے پھرتے تھے۔ کب خواجہ جی وزیر ہوں اور ان لوگوں کو سمینٹ کے ڈپو، پٹرول پمپ اور چھوٹے موٹے سرکاری ٹھیکے ملیں۔ مگر افسوس کہ دل کی دل میں رہی۔ نہ خواجہ جی وزیر ہوئے اور نہ ان کے ہمنواؤں کو "مبارکباد" پیش کرنے کا موقع ملا۔ کیونکہ پاکستان کے انقلابی طلباء، مزدوروں اور کسانوں نے گول میز کو الٹ دیا اور حقہ ٹوپی والے اس میز کے نیچے دب گئے (صرف لے دے کے جناب نورالامین بچے) — ورنہ ایوب خاں کے مقابلے پر چاندی کا حقہ لے کر بیٹھنے والی ٹوپی ... خیر چھوڑیئے بات ہو رہی تھی ایامِ گزشتہ کی۔ انسان کتنی عجیب چیز ہے ... اور اس کی یادیں بھی! آج سے تین سال پہلے عارف افتخار اور سی آر اسلم ایک ٹولے میں تھے اور اس کے مقابلے میں پنجاب میں ایک گروہ قصوری نیپ کا تھا — مگر بدلتے موسم کا کیا طرفہ تماشہ ہے کہ اب کوئی سی۔ آر نیپ اور قصوری نیپ نہیں؟ عارف افتخار — اور میاں قصوری گھوم پھر کر ایک جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں! اور قصور گردیزی اس ملاپ میں شامل ہو کر اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملنے کے چکر میں ہیں۔

اگر طبقاتی سیاست کا اصول مان لیا جائے تو یہ جدید ملاپ کچھ اتنا غیر فطری بھی نہیں بلکہ عین فطری ہے۔ کار، کوٹھیاں، دولت، اور ان کے ساتھ ساتھ سوشلزم۔ کتنی ہی باتیں مشترک ہوں تو مل بیٹھنا عین بلکہ "عینی" فطری ہی تو کہلائے گا —؟

---

وہ ایک ،، سالہ بوڑھا کسان تھا: اس کے چہرے پر پھیلا ہوا جھریوں کا جال اس کے ماضی کی پُر پیچ داستان کا عنوان تھا — اس کے نحیف بازوؤں پر ابھری ہوئی نسلیں، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اور آواز کی کپکپاہٹ، اس بات کی غماز تھیں کہ زندگی نے اس شخص کو دکھوں کے سوا کچھ نہیں دیا — اور اب جبکہ وہ موت اور زندگی کی سرحد پر کھڑا تھا تو زندگی کے آخری مرحلے نے اسے زندگی کی اس مرحلے پر بھی دکھوں کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ بننے والے ممبر بن کر روزا وقتی کی دوڑ دھوپ میں مشغول ہیں۔ کچھ انتقالِ اقتدار کے انتظار میں ہیں — اور کچھ اس فکر میں کہ الیکشن کا خرچ جلدی سے جلدی کس طرح پورا کیا جائے — نفع وغیرہ تو خیر بعد کی بات سہی۔

اس پنجاب کے بوڑھے کسان نے بتایا کہ وہ لاہور کے مضافات میں رہتا ہے اس کے دو بیٹے ہیں — جو اس کے بڑھاپے میں اس کی لاٹھی ہیں۔ دکھ سکھ کا سہارا بھی۔ الیکشن میں حکومت، پارٹیوں اور لیڈروں نے خوب خوب یقین دلایا کہ ووٹ ضمیر کی آواز ہے۔ اسے آزادی سے استعمال کیا جائے۔ اور کسی قسم کے دباؤ کو قبول نہ کیا جائے — وغیرہ وغیرہ — مگر کہنے اور کرنے میں میلوں کا فاصلہ ہے .. عوام نے تو اپنے ووٹ کا استعمال جو ان کی سمجھ میں آگیا اور آزادی سے کیا — مگر یہ بوڑھا کہتا ہے کہ اس نے اپنے ووٹ کا استعمال سرے سے کیا ہی نہیں کہ وہ ضعیفی کی باعث پولنگ اسٹیشن جا ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ بے دخلی میں جہاں اور بہت سے بے زمین کسان بے دخل ہوئے — اس بڈھے کسان کو بھی نکال دیا گیا ہے — حالانکہ یہ زمین وہ بیسیوں برس سے کاشت کرتا رہا ہے — اور اس کے بعد اس کے بیٹے اس زمین پر بطور مزارعہ کاشت کاری کرتے تھے۔ مگر گاؤں کا زمیندار کہتا ہے — جاؤ — لو بھٹو سے زمین!"

لیکن یہ تو وہ عام سی بات ہے جو آجکل اخبارات میں آرہی ہے اس بوڑھے کے ساتھ ایک ظلم اضافی ہوا ہے — وہ یہ کہ اس کے بیل زمیندار نے چوری کرا دیئے ہیں — اور کہتا ہے — "جب زمین ملے گی — تو آکر بیل بھی لے جانا ... ابھی تمہیں ان کی کیا ضرورت ہے؟"

کاش اخبارات' لیڈر صاحبان اور حکومت — اس بوڑھے کسان کی مرتی ہوئی نحیف آواز کو سن سکیں — ورنہ ... اس کے جوان بیٹے زندہ ہیں — پھر جو کچھ ہوگا وہ کون جانے ...؟

خوشی کی بات یہ ہے کہ بہت سے ترقی پسند افراد اور مزدور کسان پارٹی نے اس سلسلہ میں ہر گاؤں میں عوامی کمیٹی قائم کرکے اس قسم کے فوری مسائل کو حل کرنے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ باقی احباب بھی اس مسئلہ کی طرف فوری توجہ دیں شاید یہی وہ بات ہے جس پر کسی کو اختلاف نہ ہو؟ ماسوائے عوام دشمنوں کے! ہنزہ سے ہشت نگر تک!!!

---

# اپنے مریدوں کے بارے میں وہ خوش فہمیوں کا شکار ہیں

صفحہ ۱۴ سے آگے

شیخ مجیب الرحمٰن نے الیکشن کے بعد بیس لاکھ افراد کے اجتماع میں اپنے پروگرام کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہم سوشلسٹ اقتصادی نظام رائج کریں گے۔" پیر صاحب نے بھی ان کی یہ تقریر پڑھی ہوگی۔ مگر ان کے تازہ ترین مضمون میں اس کا کوئی حوالہ نہیں لیکن الیکشن کے بعد چھ نکات کی اس طرح برملا حمایت کر کے انہوں نے ایک طرف تو اپنے پرانے رفیقِ خاص جی۔ ایم سید کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری طرف یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ شیخ مجیب اگر پیر صاحب کی خدمات سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو وہ حاضر ہیں۔ اور وہ قشقہ کھینچ کر ترکِ اسلام کر کے دَیر میں بھی بیٹھنے کو آمادہ ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اب مجیب بھٹو اور جی۔ ایم۔ سید سے بھی بڑے سوشلسٹ ہیں۔ مجیب یہ کہتے کہتے تھک گئے کہ میرے چھ نکات مغربی پاکستان کے خلاف نہیں ہیں۔ بلکہ ان نکات سے مشرقی پاکستان ہی کو نہیں مغربی پاکستان کے صوبوں کو بھی بڑی حد تک خود مختاری مل جائے گی۔ مگر پیر صاحب نے مان کر بھی نہیں دیا اور اب جو ماننے پر آئے تو ایک ایک نکتہ پر ایمان لاتے چلے گئے۔ اب کوئی دن جاتا ہے پیر صاحب یہ اعلان کر دیں گے کہ وہ عوامی لیگ میں شامل ہو رہے ہیں۔

پیر صاحب نے موقع پرستوں اور مفاد پرستوں کے خلاف بے تحاشہ لکھا۔ مجھے ڈر ہے تاریخ ان کے بارے میں یہی کچھ نہ لکھنے لگے۔ کیونکہ عوامی لیگ اور شیخ مجیب الرحمٰن سے عقیدت کے اظہار کے جوش میں وہ انتخابی نتائج کے ایک اہم پہلو کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور اپنا متضاد بیانی کا ایک اور نمونہ پیش کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بھٹو صاحب مجیب سے تعاون کریں یا نہ کریں مغربی پاکستان کی باقی پارٹیاں سوشلزم سے بچنے کی خاطر ان سے غیر مشروط طور پر تعاون کر لیں گی۔"

اب پتہ نہیں پیر صاحب سوشلزم اختیار کرنے کے لئے عوامی لیگ میں شامل ہوں گے یا سوشلزم سے بچنے کے لئے۔ نکتہ بھی کیا ڈھونڈ کے نکالا ہے کہ "باقی پارٹیاں" سوشلزم سے بچنے کے لئے "مجیب سے تعاون کر لیں گی" گویا دُم ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہی۔ انہیں مجیب سے تعاون کرنے کے معاملے میں بھٹو صاحب پر تو شبہ ہے مگر باقی پارٹیوں پر یقین ہے۔ اسے کہتے ہیں مار دل گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ ایک طرف تو وہ چھ نکات کے گن گاتے ہیں یعنی گلگلے کھا لیتے ہیں مگر دوسری طرف سوشلزم کا گڑ کھانے سے احتراز کرتے ہیں۔ حالانکہ شیخ مجیب سوشلسٹ اقتصادی نظام رائج کرنے کے لئے اپنے پروگرام کا اعلان کر چکے ہیں۔ پیر صاحب جیسے سیاسی بصیرت و بصارت کا دعوےٰ کرنے والے آدمی سے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ لوگوں کو اپنی قلابازیاں دیکھنے کا اتنی جلدی جلدی موقع دیں گے۔ اس معاملہ میں تو انہوں نے سوشلسٹ روسی سرکس والوں کو بھی مات دے دی۔ ایک سطر میں دعویٰ، دوسری سطر میں اس کی تردید۔ ہر دعویٰ ایک نئی بنیاد پر کھڑا کرتے ہیں۔ پھر خود ہی اس بنیاد کو ڈھا دیتے ہیں۔ اور یہ یقین کر لیتے ہیں کہ پڑھنے والے ہنسیں گے نہیں۔ ذرا پیر صاحب سے کوئی یہ تو پوچھے کہ جماعت اسلامی۔ جماعت اہل سنت، جمیعت العلمائے اسلام (ہزاروی گروپ) قیوم مسلم لیگ۔ کونسل مسلم لیگ۔ کنونشن مسلم لیگ۔ کیا شیخ مجیب الرحمٰن سے تعاون پر تیار ہو جائیں گی۔ اور وہ بھی سوشلزم سے بچنے کی خاطر جبکہ اسی مضمون میں اسلامی جماعتوں کے بارے میں پیر جی نے تحریر فرمایا ہے کہ:

"میرے خیال میں اب اس کے بعد یہ حضرات (علمائے کرام) سیاسی طور پر بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکیں گے۔ البتہ بانگ صلوٰۃ۔ مساجد کی امامت۔ نکاح خوانی اور نماز جنازہ کے کام کاج کے لئے اب بھی ان کی مانگ باقی رہے گی۔"

پیر صاحب جن علمائے کرام کو ہدف تضحیک بنا رہے ہیں انہوں نے قومی اسمبلی میں چودہ نشستیں حاصل کی ہیں۔ جماعت اہل سنت نے بھی سات اور ہزاروی گروپ نے بھی سات۔ ان کے مقابلے میں جماعت اسلامی کی حاصل کردہ نشستوں کی تعداد صرف چار ہے۔ پیر جی کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ علمائے کرام صرف نظریہ پاکستان کی نماز جنازہ ہی نہیں پڑھائیں گے۔ بہت سے سیاسی مُردوں کی تجہیز و تکفین کا بھی انتظام کریں گے۔ اور سوشلزم سے بچنے کی خاطر نہیں۔ فی سبیل اللہ پیر صاحب کو تو اس کا تجربہ ہوگا۔ پیر صاحب کو اس کا تجربہ ہوگا کہ حزب اختلاف کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ موثر قوت بھی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ اتحاد فکر پیدا ہو جائے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ پیر صاحب اپنے ساتھ سب کو پراگندہ خیالی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی ایسے نازک مرحلہ پر جبکہ ملک کا آئین بنایا جانے والا ہے۔ ان کی یہ کتنی عجیب منطق ہے کہ مسٹر بھٹو تو شیخ مجیب سے تعاون نہیں کریں گے جن کی پارٹی نے قومی اسمبلی کی ۸۱ نشستیں جیتی ہیں۔ اور نہ شیخ مجیب کو بھٹو صاحب کا تعاون درکار ہوگا۔ کیونکہ وہ سوشلزم کے مخالف ہیں۔ بلکہ شیخ مجیب کو اسلام پسندوں کے اشتراک کی ضرورت پڑے گی۔ جو سوشلزم سے بچنا چاہتے ہیں۔ چہ خوب!

اب قارئین خود نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ پیر صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ ون یونٹ کے بنانے والوں میں شامل تھے۔ ون یونٹ ٹوٹا تو اس کی حمایت کرنے لگے۔ سوشلزم کو کفر قرار دیتے تھے۔ اب خود یہ کفر اختیار کرنے کو تیار ہیں۔ شیخ مجیب سب سے بڑے وطن دشمن تھے۔ اب ان سے بڑا کوئی وطن دوست نہیں چھ نکات سے پاکستان تباہ ہو رہا تھا۔ اب محفوظ ہو گیا ہے۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

لیکن ایک ہی مضمون میں اس قدر تضاد بیانیاں! خلاصہ اور مقصد ان تضاد بیانیوں کا یہ ہے کہ اصلی سوشلسٹ بھٹو صاحب ہیں اور مجیب صاحب نقلی سوشلسٹ۔ اس لئے اصلی سوشلسٹ سے بچنے کے لئے نقلی سوشلسٹ کی حکومت میں شامل ہو جاؤ۔ حکومت چاہے چھن جائے حکومت کرنے کی خو نہ جائے اسے کہتے ہیں میٹھا میٹھا ہپ کڑوا کڑوا تھو۔

پیر صاحب نے اپنے مضمون کا اختتام اس فقرہ

پر کیا ہے۔

" میری ناچیز رائے یہ ہے کہ ہم کو اپنے جمہور کا فیصلہ بہ طیب خاطر تسلیم کر لینا چاہیئے۔ پاکستان کا جمہور اب جاگ اٹھا ہے۔ آپ اس کے فیصلوں کا احترام کرنے پر مجبور ہیں یہ بندہ نواز جمہور کو سلانے والے کون لوگ تھے؟ بہر حال آپ کی رائے کے مطابق چونکہ پاکستان کا جمہور اب جاگ اٹھا ہے اس لئے آپ لمبی تان کر سو جایئے کبھی تو نجات ملے۔

## بقیہ: اردو سندھی کا جھگڑا

ہنگامے ہوں گے۔ فسادات ہوں گے۔ لوٹ مار، خنجر زنی، آتش زنی کے حادثات ہوں گے۔ یہ تباہی کا راستہ ہے عوام کو گمراہ کرنے کا راستہ ہے۔ عوام کے معاشی استحصال کو طول دینے کا راستہ ہے یہ برطانوی نوآبادکاروں کا بتایا ہوا راستہ ہے "لڑاؤ اور حکومت کرو"۔

اس لسانی جھگڑے کا فوری اور واحد حل یہ ہے کہ سندھی کو سرکاری زبان بنانے کے جو فیصلے لئے گئے ہیں انہیں واپس لیا جائے۔ اس مسئلہ کو صوبائی اسمبلی کے روبرو پیش کیا جائے جہاں اس کے تمام پہلوؤں سے بحث کی جائے ایسی کمیٹیاں قائم کی جائیں جن میں ماہرین تعلیم، ماہر لسانیات، اہل قلم اور دانشور اور عوامی نمائندے شامل ہوں۔ جو افہام و تفہیم کے ساتھ مسئلہ کا ایسا حل تلاش کریں جو عوام کے لئے قابل قبول ہو۔ نوکر شاہی یا کسی خاص طبقے کی بجائے عوام کے مفاد میں ہو۔ یوں بھی انتخابات کے بعد نوکر شاہی کو ایسے اہم قومی اور عوامی فیصلے کرنے کا کوئی حق نہیں یہ سندھی اور اردو بولنے والے عوام کے خلاف سازش ہے۔

## بقیہ:- کیوبا

غم آلود روداد سن کر صدر کینیڈی امریکی فضائیہ کے استعمال کی اجازت دے دیں گے۔

لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس طیارے کی حفاظت کے لئے جانے والے دونوں امریکی طیاروں کو کیوبا کی طیارہ شکن توپوں نے مار گرایا لیکن یہ طیارہ نہ صرف ہوائی اڈے پر اتر گیا بلکہ میٹیاس فریاس کو واپس بھی لے آیا۔ لیکن اس سے قبل کہ صدر کینیڈی اس کو دیکھ اور اس کی داستان سن سکتے "سی آئی اے کیوبا میں فوجی اور واشنگٹن میں سیاسی جنگ ہار چکی تھی۔ کیوبا کی افواج نے تمام حملہ آوروں کو پسپا کر دیا تھا۔ [illegible] بے شمار ہلاک ہو گئے تھے

صدر کینیڈی نے بعد میں تسلیم کر لیا کہ یہ حملہ امریکہ کی ایما پر ہوا تھا۔ انہوں نے تمام تر ناکامی کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ لیکن چند دنوں بعد ایک سرکاری ترجمان نے اس حملے کی ناکامی کا ذمہ دار سی آئی اے کو قرار دیتے ہوئے اس کی جو وجوہات بیان کیں وہ یہ تھیں۔

۱۔ "سی آئی اے نے غلط معلومات فراہم کیں۔ ہمیں کیوبا کے عوام اور فوج کی حب الوطنی اور وفاداری کے بارے میں غلط اطلاعات دی گئیں۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ حملے کی صورت میں عوام اور فوج حملہ آوروں کے ساتھ مل جائیں گے کیونکہ وہ کاسترو کی سوشلسٹ حکومت سے تنگ آ چکے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت ایسا نہ تھا۔ کیوبا کے عوام حملہ آوروں کو پسپا کرنے میں فوج کے شانہ بشانہ داد شجاعت دیتے رہے۔"

۲۔ "ہمیں کیوبا کی فضائی اور فوجی قوت کے بارے میں غلط اعداد و شمار مہیا کئے گئے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ سی آئی اے کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ کیوبا کی فضائی فوج میں روسی ساختہ مگ ۱۷ کا ایک اسکواڈرن بھی شامل ہے۔ سی آئی اے نے ہمیں صرف اتنا بتایا تھا کہ کیوبا کے پاس صرف ایک اسکواڈرن ہے جبکہ اس کے پاس دو اسکواڈرن تھے۔"

اس طرح کیوبا پر حملے کی ناکامی اس دشمنی کا پہلا سبب تھی جو صدر کینیڈی اور سی آئی اے کے درمیان پیدا ہوئی اور جس کا اختتام صدر کینیڈی کے قتل پر ہوا۔

## بقیہ:- کینیڈا

ایٹمی توانائی کے بڑھتے ہوئے استعمال کے پیش نظر یورینیم کی برآمد کو محدود کر دیا ہے۔ قرائن بتاتے ہیں کہ کینیڈا کی حکومت قومی صنعت کو فروغ دینے کے لئے لوہے، پوٹاش اور سونے کی درآمدات کو بھی محدود کر دے گی۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ حکومت کینیڈا سیسہ اور تانبہ کی برآمدات کو مکمل طور پر بند کر دے۔ کیونکہ یہ دھاتیں دنیا میں نایاب ہو رہی ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ اس کرۂ ارضی پر سیسہ اور تانبہ کی جتنی مقدار موجود ہے وہ زیادہ سے زیادہ بیس سال تک چل سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امریکہ کی حکومت کینیڈا کو سیاسی چالبازیوں، سودے بازیوں اور سرمایہ کاری کے ذریعے دبانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ لیکن کینیڈا کی حکومت نے اپنی خارجی صورت حال میں بعض اہم نوعیت کی تبدیلیاں لا کر امریکی دباؤ کو کمزور کر دیا ہے۔ کینیڈا نے سوشلسٹ ممالک بالخصوص چین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر اور امریکہ کی جنوب مشرقی ایشیا کی پالیسی سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے قومی امتیاز اور حق خود اختیاری میں جان ڈال دی ہے

## بقیہ: جامعہ کراچی

مرتبہ دیار غیر بھیجا اور اس سال پھر انہیں لیبیا بھیج دیا گیا ہے

سنا گیا ہے کہ شعبہ نباتات کے یہ ریڈر جب پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر پاکستان آئے تو انہوں نے جھوٹا بیان دے کر اپنی عمر کم کرانے کی کوشش کی جو ناکام رہی اس کے بعد جب وہ مغربی جرمنی جانے لگے تو پاسپورٹ کی درخواست اپنی عمر پانچ سال کم لکھی اور ظاہر کیا کہ اس سے قبل انہیں پاسپورٹ نہیں ایشو ہوا تھا۔ اس غلط بیانی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کے موجودہ پاسپورٹ میں جو عمر درج ہے وہ ان کی سروس بک میں مندرج عمر سے پانچ سال کم ہے حد تو یہ ہے موصوف نے جامعہ کے قوانین کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے ابھی تک اپنی سروس بک میں دستخط نہیں کئے ہیں کیونکہ ابھی جماعتی رجسٹرار ہیں۔

اب نجم الدین صاحب، شیخ الجامعہ کے ساتھ مل کر این۔ ایس۔ ایف کے کارکنوں کو جامعہ میں داخلہ دینے سے انکاری ہیں۔ یہ اختیارات انہیں یونیورسٹی آرڈیننس نے دیئے ہیں۔ محب وطن اور سامراج دشمن عوامی طاقتوں کا مطالبہ ہے کہ اس کالے قانون کو فوری پر منسوخ کیا جائے اور تمام طلبہ کو داخلے دیئے جائیں۔ ورنہ عوام ایسی تحریک کا آغاز کریں گے جس کا سیل رواں ایوبی آمریت کی طرح جامعہ کراچی کے موٹے دیاں کی آمریت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔

Regd No : S - 2772
**Weekly "Al - Fatah" Karachi**
28. JAN.-4. FEB. 1971



# سامراج ٹھاہ

کمبوڈیا کے پرنس سہانوک اور شمالی ویت نام کے فام وان ڈونگ۔ کمبوڈیا کے حریت پرستوں نے سرکاری فوجوں پر اس ہفتے خوفناک حملہ کر کے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔



جنوبی افریقہ کو اسلحہ فراہم کرنیکے برطانوی اصرار سے دولتِ مشترکہ کے ٹوٹنے کا وقت قریب آگیا ہے۔ افریقہ کے عوام سامراج کے خلاف جنگ جاری رکھنے کا عزم کئے ہوئے ہیں

۲۸ جنو...